مقالاتِ یومِ اقبال

بسلسلۂ

یومِ اقبال منعقدہ رضا انٹر کالج (رامپور)

۱۹۴۵ء

مرتبہ

آل احمد سرور

(مطبوعہ ہندوستان پریس رامپور)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

رضا کالج میگزین آج چھ سال کے وقفے کے بعد دوسری مرتبہ شائع ہو رہی ہے۔ اِس پانچ چھ سال کے عرصے میں دُنیا جس طوفانی دَور سے گذری ہے وہ خود ایک تاریخ ہے جس کی مثال پچھلی تاریخوں میں نہیں مل سکتی۔

طوفان جنگ

عالمگیر جنگ کا یہ طوفان کسقدر بلا خیز تھا۔ دُنیا کا کوئی ملک کوئی شہر اور کوئی گوشہ اس کی زد سے نہ بچا سلطنتیں تباہ ہوگئیں، نظام درہم برہم ہو گئے، آمر اور اُن کی آمریت اُن کے اُصول و آئین فنا ہو گئے، لاکھوں ناکردہ گناہ بھی اس آگ کا ایندھن بنے۔ جس طرح اکثر بجلی گرنے کے بعد بارش تھم جایا کرتی ہے اس طوفان میں بھی یکا یک دو مرتبہ بڑے زور شور سے قیامت خیز بجلیاں گریں جنھوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے شہروں کو آناً فاناً پھونک کر خاک سیاہ کر ڈالا۔ طوفان تھم گیا۔ طوفان بیشک تھم گیا لیکن ابھی مطلع بالکل صاف صاف ہو جائے اور آفتاب کی شعائیں پوری تیزی سے چمک کر ہر گوشے میں گرمی اور روشنی پہونچا دیں تو اُس کی تباہ کاریوں کے اثرات سے مکمل نجات ملے۔

رامپور کی رفتار ترقی:-

خدا کا شکر ہے کہ باوجود اِس جنگ عالمگیر کے ہمہ گیر اثرات کے جس سے رامپور بھی قدرتاً دوچار رہا

اور جس کے فتح ظفر کے ساتھ خاتمے میں مساعی ریاست پوری سرگرمی سے شامل حال رہیں، یہاں کی عام رفتار ترقی بدستور قائم رہی۔ تعلیمات بھی دیگر شعبوں کی طرح برابر ترقی پذیر ہے۔ خوش قسمتی سے اس شعبے میں وہ ایسی ہستیوں کا اضافہ ہوا ہے جن پر رامپور کی تعلیمی دنیا جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ خواجہ غلام السیدین صاحب جن کی مایہ ناز شخصیت علمی اور ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، رامپور کے مشیر تعلیمات مقرر ہوئے ہیں۔ موصوف نے تشریف لاتے ہی اس شعبے میں جن اصلاحات کا نفاذ فرمایا ہے اور آئندہ ترقی کے لئے جن تجاویز کو مرتب فرمایا ہے اُنکے پیش نظر رامپور کی تعلیمی فضا کا مستقبل نہایت شاندار نظر آرہا ہے۔

دوسرے خود ہمارے کالج کے پرنسپل صاحب یعنی پروفیسر آل احمد سرور صاحب کی ذات گرامی ہے۔ آپ نے بھی تشریف لاتے ہی اپنی مخصوص ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کا جو ثبوت اس قلیل مدت میں دیا ہے اس سے کالج کی فضا میں ایک نئی زندگی دوڑ گئی ہے۔

یوم اقبال:-

ادبی سرگرمیوں کا شاندار افتتاح پرنسپل صاحب کی تشریف آوری کے چند ہی دنوں بعد "یوم اقبال" کی صورت میں ہوا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۴۵ء کو علامہ اقبال مرحوم کی وفات کی سالانہ یادگار کے سلسلہ میں ایک عظیم الشان جلسہ کالج میں منعقد کیا گیا۔ جلسے کا انعقاد ایک وسیع پنڈال میں ہوا۔ بیرونی حضرات میں سے پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی اور مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے دیگر اساتذہ و طلباء نے خاص طور پر شرکت فرمائی۔ نشست اول کا اجلاس صبح کو ہوا اور اس کی صدارت پروفیسر صاحب موصوف نے فرمائی۔ جلسے کا آغاز تلاوت قرآن شریف سے ہوا۔ کالج کے چار چھوٹے چھوٹے لڑکوں نے علامہ اقبال کی مشہور نظم "از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز" کو کورس کے طور پر گا کر سنایا، پھر دیگر طلباء نے علامہ مرحوم کی چند نظمیں اور غزلیں نہایت خوش الحانی سے پڑھکر سنائیں۔ رشید احمد صاحب صدیقی نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز سے خطبۂ صدارت کا آغاز فرمایا ایک نہایت پر مغز اور عالمانہ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں علامہ اقبال مرحوم کے فلسفہ و پیام کی وضاحت فرمائی۔ پرنسپل صاحب نے اقبال کے خطوط' کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا جو تحقیق و ریسرچ کے اعتبار سے ایک زبردست ادبی شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اور اقبال مرحوم کے متعلق لٹریچر میں ایک گراں بہا اضافہ ہے۔

اس کے بعد دیگر مقالات پڑھے گئے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت اہم اور قابل قدر ہیں۔ پہلی نشست دوپہر کو ختم ہوئی۔ حاضرین کی تعداد بہت کافی تھی اور پنڈال سے باہر تک مجمع موجود تھا۔ لاؤڈ اسپیکرز کا انتظام نہایت معقول تھا۔ خواتین کے لئے پردے کا علیحدہ انتظام تھا اور اُن کی ایک خاصی تعداد نے شرکت کی۔ نشست دویم کا اجلاس سہ پہر کو عالیمرتبت خواجہ غلام السیدین صاحب مشیر تعلیمات کے زیر صدارت ہوا۔ موصوف اپنا عالمانہ خطبۂ صدارت ارشاد فرمارہے تھے کہ طوفانِ باد و باراں نے پنڈال کو آگھیرا۔ حملہ اسقدر شدید تھا کہ سارا پنڈال اُس کی زد میں آگیا لیکن فوراً ہی سارا مجمع کالج کے ہال میں داخل ہوگیا اور چند منٹ ہی میں ہال کے اندر جلسہ بدستور قایم ہوگیا۔ عناصر کا یہ تشدد شرکاء جلسہ کے جوش و خروش میں اور زیادہ اضافے کا باعث ہوگیا اور بقول خواجہ صاحب اقبال کی محفل میں طوفان کا آنا تعجب نہ تھا نہ آنا تعجب ہوتا۔ خواجہ صاحب نے اپنا ایک مطبوعہ مقالہ پڑھ کر سُنایا جو موصوف کے زبردست علم و فضل ادبی ژرف نگاہی اور اقبال مرحوم کے متعلق نظر غائر کا آئینہ دار تھا۔ طلبا نے چند اور غزلیں اور نظمیں سُنائیں اور متعدد عالمانہ مقالے پڑھے گئے جس میں اقبال مرحوم کی زندگی فلسفہ و پیغام کو پیش کیا گیا۔ جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ شام کو برخاست ہوا۔

آرٹ نمائش

یوم اقبال کے دوران میں کالج میں ایک تصویروں کی نمائش کا انعقاد ہوا۔ اِس نمائش میں ہمارے کالج کے آرٹ لکچرار عظمت اللہ خاں صاحب اور محکمۂ تعلیم کے ایک نوجوان آرٹسٹ (نہایت افسوس کے ساتھ عرض کیا جاتا ہے آپ کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون) ادیا ما صاحب کے آرٹ کے کارنامے پیش کئے گئے۔ اِس نمائش کی افتتاح عالیمرتبت سید بشیر حسین زیدی صاحب بہادر چیف منسٹر ریاست رامپور نے فرمائی۔ جناب پرنسپل صاحب نے دونوں فن کاروں اور اُن کے کارناموں کا تعارف کرایا، اور چیف منسٹر صاحب بہادر نے اپنی ایک مختصر لیکن نہایت جامع تقریر میں آرٹ اور اس سے تاریخی اور تنقیدی پہلو پر اظہار خیال فرمایا۔ اِس کے بعد نمائش کا آپ نے باقاعدہ افتتاح فرمایا۔ نمائش نہایت کامیاب رہی اور مصوری کے نہایت عمدہ شاہکار پیش کئے گئے جن کو بہت پسند کیا گیا۔ رامپور کے خطاطی کے کارنامے بھی جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت ہی قابل قدر اور نادر ہیں اِس نمائش میں فراہم کئے گئے تھے۔

یونین کی تنظیم:-

کالج یونین کی امسال از سرِ نو تنظیم عمل میں آئی اور اُس کو صحیح معنوں میں علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز بنایا گیا۔ نائب صدر اور سکریٹری کا باقاعدہ انتخاب عمل میں آیا اور طلبا نے نہایت جوش و خروش کا اظہار کیا۔ یونین کے ماتحت آئے دن تقریروں اور مباحثوں کا ایک سلسلہ قایم ہوگیا ہے، پرنسپل صاحب خود ہر جلسہ کی صدارت فرماتے ہیں۔ طلبا اور اساتذہ اِن مباحثوں میں نہایت ذوق و شوق اور دلجمعی سے حصہ لیتے ہیں۔ تقریروں کے ایک باقاعدہ سلسلے کا آغاز ہوگیا ہے جس میں خود کالج کے اساتذہ اور بیرونِ کالج سے مقتدر ہستیاں یونین میں تشریف لاکر مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرتی رہتی ہیں ۔۔ تقریروں کا سلسلہ جس میں ملک کی گراں قدر شخصیتیں جو اپنی علمی اور ادبی حیثیت سے خاص شہرت کی مالک ہیں حصہ لیتی ہیں، نہایت ہی مقبول اور کامیاب ہوا ہے۔ اسوقت تک ایسی پندرہ بیس تقریریں ہو چکی ہیں اور علم و فن کے ہر شعبے، تحقیق و تنقید، سائنس، فلسفہ، ادب، سیاسیات، اقتصادیات وغیرہ پر نہایت عالمانہ اور محققانہ نظریے پیش کئے گئے ہیں۔ پرنسپل صاحب کی اسکیم کے مطابق ہندوستان کی تمام چیدہ ہستیاں جو علم و ادب کے کسی نہ کسی شعبے میں مشہور و معروف ہیں اِسیطرح وقتاً فوقتاً یہاں تشریف لاکر اپنے افکار و آرا پیش کرتی رہیں گی۔ حال ہی میں یونین کے ماتحت ایک ادبی مشاعرہ بھی ہوا جو بقول پرنسپل صاحب تمام مشاعروں سے مختلف، شعر و ادب کی محفل تھی۔ رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی، حضرت روشؔ صدیقی، جاں نثار اخترؔ صاحب، صاحبزادہ واجد علی خاں صاحب بہادر، حضرت سحرؔ رامپوری، حضرت رازؔ مرادآبادی وغیرہ وغیرہ نے اپنے کلام سُنائے۔ روشؔ صدیقی صاحب نے شعر و ادب کے متعلق تقریر میں بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور خود پرنسپل صاحب نے صدارتی تقریر فرمائی نیز اپنی دو نظمیں "محمد علی" اور "ٹیپو" بھی پیش کیں جو بہت پسند کی گئیں۔

غرض یونین علمی و ادبی سرگرمیوں کا ایک ایسا مرکز بن گئی ہے جس نے کالج کی فضا پر چھا کر ہر فرد میں علم و ادب کی ایک لہر دوڑا دی ہے اور مستقبل کے متعلق نہایت خوش آیند توقعات قائم ہوگئی ہیں۔

لائبریری و ریڈنگ روم:-

کالج کی لائبریری اور دار المطالعہ کو بھی حال ہی میں ایک بڑے پیمانے پر وسعت دی گئی ہے۔

لائبریری میں جدید اردو، ہندی، انگریزی لٹریچر سے متعلق نئی نئی کتابوں کا قابلِ قدر اضافہ کیا گیا ہے، سابق ڈرائنگ روم میں جو ایک کشادہ کمرہ ہے لائبریری اور دارالمطالعہ منتقل کر دیا گیا ہے۔ طلبا کے لئے مطالعۂ اخبارات و رسائل کا نہایت معقول انتظام کیا گیا ہے۔ اُن کی نشست کے لئے بہت کافی اور وسیع طور پر مختلف بلاک بنا دیئے گئے ہیں۔ اخبارات و رسائل کی تعداد اتنی بڑھا دی گئی ہے کہ ملک کے قریب قریب تمام مقتدر انگریزی اور ہندی اور فارسی اخبارات و رسائل اس میں شامل ہیں، خالص سیاسی و ادبی کے علاوہ تعلیم، اقتصادیات، تاریخ، سائنس وغیرہ موضوعات پر بھی رسائل علیحدہ آتے ہیں۔ طلبا بڑے انہماک اور ذوق و شوق کے ساتھ اپنے خالی گھنٹوں میں مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور اُن کی معلومات میں معتدبہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

بیالوجی بلاک:-

اِمسال کالج میں بیالوجی کے مضمون کا بھی اضافہ ہو گیا ہے اور اُس کی باقاعدہ خواندگی شروع ہو گئی ہے۔ "بیالوجی بلاک" کی تعمیر قریب قریب مکمل ہو گئی ہے اور جملہ سامان بھی فراہم ہو گیا ہے۔ یہ عمارت نہایت خوبصورت ہے اور بیالوجی سیکشن کے تمام لوازمات کا اُس میں انتظام کیا گیا ہے۔

کھیل اور ورزشیں:-

دماغی ترقی اور نشوونما کے ساتھ جسمانی ترقی اور صحت کی طرف خاص توجہ مبذول کی گئی ہے۔ ہر قسم کے کھیلوں کا باقاعدہ اِنتظام کیا گیا ہے اور روزانہ اُن کی مشق ہوتی ہے۔

میگزین:-

اِس مجموعی ترقی کے ساتھ ساتھ کالج میگزین کا بھی دوبارہ احیا ہوا ہے اور یہ پہلا نمبر پیش کیا جا رہا ہے۔ اِس میں "یوم اقبال" کے سلسلے میں جو مقالات پڑھے گئے تھے اُس میں سے اکثر شامل ہیں اور میگزین کی خوش قسمتی ہے کہ اِس کے پہلے نمبر میں پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا خطبۂ صدارت جو "یوم اقبال" کے موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا ہے بعینہٖ پیش کیا جا رہا ہے۔ دیگر مقالات میں مولوی عبدالسلام صاحب رامپوری کا مقالہ "اقبال اور محی الدین عربی" ڈاکٹر مسعود حسن صاحب لکچرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا

مقالہ فلسفۂ اقبال کے چند مسائل اور نور محمد صاحب ایم اے علیگ کا مقالہ اکبر اور اقبال شامل ہیں۔ اِن کے علاوہ ایک اور نہایت دلچسپ اور دلکش مقالہ "اقبال میری نظر میں" کرنل عطاء الرحمٰن صاحب بی اے، کا اِن ہی صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔ میاں صاحب نے یہ مقالہ یوم اقبال کے واسطے تیار فرمایا تھا لیکن پھر اسوقت شرکت نہ ہونے کے باعث کالج یونین کے ایک جلسے میں آپ نے پڑھکر سُنایا، اپنے مخصوص انداز بیان اور موضوع کے اعتبار سے ایک یہ مقالہ ایک منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ میگزین کو اقبال مرحوم ایک شاگرد کے اِن تاثرات کو پیش کرنے کا فخر حاصل ہے جنھوں نے اقبال کو بہ حیثیت اُستاد دیکھا اور اُن سے پڑھا۔ پرنسپل صاحب نے اپنا ایک مضمون "خطوط میں شخصیت کا اظہار" جو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے نشر ہو چکا ہے عنایت فرمایا ہے۔ دیگر مضامین میں مفتی بشیر الدین احمد صاحب لکچرار اُردو رضا انٹر کالج کا مضمون، مولانا محمد علی کی اِنشا پردازی، اور طلبا کے مضامین میں جوش کی شاعری، سیارۂ مریخ کا دلکش معمہ، ایٹم بم، شعر کی حقیقت وغیرہ شامل ہیں، اِن کے علاوہ طلبا کی نظمیں اور غزلیں بھی درج ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ طلبا کے بیشتر مضامین شائع نہ کئے جا سکے جن کے وجوہ مختلف ہیں، اِن مضمون نگار نوجوانوں کو قطعاً مایوس نہ ہونا چاہئے آئندہ میگزین کے صفحات اس کی تلافی کر دی جائے گی۔ اِتنا ضرور عرض ہے اِس دَور میں جہاں ایک طرف بازاری قسم کے لٹریچر کی بھی گرم بازاری نظر آتی ہے اور اکثر مصنوعی اور پست جذبات سے کھیلنے کا نام اَدب ہے ہمیں بہت ہمت اور استقلال سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ہم کو چاہئے کہ کورانہ تقلید سے بچتے ہوئے خلوص کے ساتھ سچے جذبات کے اظہار کو اپنا مسلک قرار دیں، سادگی، معصومیت، جاذبیت اور دلچسپی تحریروں میں خود بخود پیدا ہو جائے گی جو اَدب میں کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔

آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اِس میگزین میں جہاں جہاں طلبا کی اَدبی کاوشیں پیش کی گئی ہیں یہ اُن کے جذبات کا آئینہ ہیں اِس لئے اربابِ نظر سے اِستدعا ہے کہ اُن کے مضامین کو تنقید کی کڑی میزان پر نہ تولیں بلکہ یہ دیکھیں کہ کس مضمون نگار میں صلاحیت موجود ہے۔

اِدارہ

خطبۂ صدارت

از پروفیسر رشید احمد صدیقی صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی
علیگڑھ

جو یوم اقبال کے موقع پر رضا کالج رامپور میں ۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو دیا گیا۔

بزرگان رامپور، دوستو اور عزیزو، آپ نے مجھے یاد فرما کر میری توقیر بڑھائی اسے میں ذاتی منزلت کیساتھ ساتھ شعبۂ اردو کی بھی منزلت سمجھتا ہوں جس کے متعدد ارکان اس وقت آپ کے سامنے موجود ہیں۔ سرور صاحب آپ ہیں ممکن ہے پرانے ہو چلے ہوں لیکن ان کی یاد ہمارے یہاں تازہ ہے اور مدتوں تازہ رہے گی۔ دوسرے مسٹر مسعود حسین خاں ایم اے ہیں جن کا مقالہ آپ سہ پہر میں سنیں گے، یہ ہمارے ہاں پی، ایچ، ڈی کے طالب علم اور شعبہ میں معلم بھی ہیں، تیسرے مسٹر نور محمد ہیں جنھوں نے اردو میں ایم اے فائنل کا امتحان دیا ہے۔ ان کا مقالہ بھی آپ کے سامنے آئے گا۔

صاحبو، مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اقبال مرحوم کا کلام کبھی ڈیفنس آف انڈیا کی زد میں آیا تو آپ کے آل احمد سرور صاحب سب سے پہلے گرفتار کر لئے جائیں گے باوجود اس کے کہ انھوں نے ریاست میں پناہ لی ہے۔ سرور صاحب نے اقبال کے کلام کا مطالعہ جس الفت و قابلیت سے کیا ہے شاید ہی کسی اور نے

کیا ہو۔ اِس کا نتیجہ ان کے حق میں قابلِ رشک نہیں رہا ہے۔ اقوال سے گزر کر کہیں اُنھوں نے اپنے اعمال میں بھی اقبال کو دخل دینا شروع کیا تو میں سمجھتا ہوں ریاست رامپور اور مسلم یونیورسٹی کے درمیان کہیں معلق نظر آئیں گے کو مجھے اِس کا یقین ہے کہ وہ اِس حال میں بھی یومِ اقبال منانے سے باز نہ آئیں گے۔

صاحبو، اُردو شاعری کی تاریخ کا یہ پہلو آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ اُردو شاعری ہمارے گفتنی و ناگفتنی حالات کی جس حد تک ترجمان رہی اُس حد تک ان حالات کو بہتر و برتر بنانے میں معین نہ ہوئی۔ ہمارے شعر و ادب میں علیگڑھ تحریک یا حالی کے عہد سے پہلے ذہنی تجربوں یا تہلکوں کے نشان نہ ملنے کے برابر ملتے ہیں۔ ہمارے شعرا شاعری میں عبادت تو خوب خوب کرتے تھے حسنِ عمل سے کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے۔ وہ مشکل بحر قافیہ اور ردیف میں جلد سے جلد سہ غزلہ چہار غزلہ تیار کر لیتے تھے لیکن زندگی اور زمانے کے مطالبے کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ ان کے ہاں "شکست کی آواز" ملتی ہے دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان نہیں ملتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ان شعرا پر زندگی و زمانہ کی چوٹوں کا اثر نہ ہوتا تھا۔ البتہ وہ ان چوٹوں کو ابنائے جنس کی چوٹ سمجھنے سے قاصر تھے۔ بعض دوستوں نے اُن کی متفرق نظموں یا غزلوں میں زندگی اور زمانہ کا کرب یا دھڑکن دریافت کی ہے لیکن میں اس نظریہ کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں حسنِ ظن سے ہم نے جہاں اور بہت سے معرکے سَر کئے ہیں یہ ایک سہی! اردو شاعری میں ہمارے بیشتر شعرا نے تفریح یا تفرج سے اور کام لیا ہے۔ شاید ہی کسی اور ملک یا ادب میں شاعری کی یہ گت بنی ہو۔ محض چند ایک سے قطع نظر بقیہ نے زندگی کا غم غلط کرنے کی خاطر شاعری کی پناہ پکڑی۔ زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لئے شاعری نہیں کی۔

صاحبو، میں اتنا ماننے کے لئے تیار ہوں کہ ہمارے ہاں کچھ شعرا ایسے گذرے ہیں جنھوں نے ہمارے ذہنی رجحانات کو بعض نازک مواقع پر اچھے راستہ پر لگایا ہے اس کی پہلی مثال **انیسؔ** کے ملتی ہے۔ لکھنؤ میں اُردو شاعری کا جو رنگ و آہنگ تھا اُس کو منقلب کر دینے کا سہرا انیسؔ اور انیسؔ کے خاندان کے سر ہے۔ اُنھوں نے قوم کے مزاج کو پہچان کے شاعری کا رُخ بدلا لیکن اپنے زمانہ کے ڈھنگ کو نہ بدل سکے۔ شعر و ادب کو گرانمایہ کیا۔ مذہبی شاعری میں **محسنؔ** کاکوروی کا نام بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ محسنؔ کے اِس کمال کا اعتراف کم لوگوں نے کیا ہے کہ وہ لکھنؤ کے تنہا شاعر ہیں جنھوں نے لکھنوی شاعری کے کمزور پہلو کو اپنے نعتیہ کلام سے دلکش بنا دیا۔ دیاشنکر نسیمؔ ان سے پہلے

گذرے ہیں جن کی گلزار نسیم کی بے ساختہ صناعی کی نظیر ہماری شاعری میں نہیں ملتی۔ لیکن جس پل صراط پر محسن کو چلنا پڑا نسیم اس سے بالکل محفوظ رہے۔ انیس اور دبیر کے کلام نے ہمارے ادبی مزاج کو سدھارا اور سنوارا۔ بالخصوص اس وقت جب ہمارے ہاں سوداؔ مزاج کے سوا کچھ اور نہیں رہ گیا تھا۔

انیسؔ کے بعد حالیؔ نے اُردو شعر و ادب کے دھارے کو موڑا اور اس کو ایسی وادیوں سے گذرنے کا موقع دیا جہاں نہ صرف اس دھارے کی حیات بخشی میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی روانی میں زور آیا۔ حالیؔ سے پہلے شعرا تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش میں بطور کارِ خیر شریک ہو جایا کرتے تھے۔ حالیؔ زہرِ غم قلب و جگر میں اُتار چکے تھے۔ ان کا رنج و الم شخصی یا رسمی نہ تھا۔ اِن کے ماتم سے اِنسانیت ماتم گسار نظر آنے لگتی تھی۔ حالیؔ کے ماتم میں حرکی و تخلیقی استعداد پائی جاتی ہے۔ حالیؔ نے غالباً سب سے پہلے اِس حقیقت کو پیش کیا کہ خلوص و دردمندی، علم آرٹ اور انسان سب کی معراج ہے۔ شاعری میں حالیؔ نے سچائی کو آزمائش و زیبائش پر ترجیح دی۔ حالیؔ کا لہجہ دھیما ہے لیکن اس میں یہ قابلیت ہے کہ وہ شور و سکوت دونوں میں یکساں سنائی دیتا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حالیؔ کی شاعری نے مسلمانوں میں اضمحلال و افسردگی پیدا کر دی۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ حالیؔ کی مثال اُس شخص کی ہے جو سردار کی بے گور و کفن نعش پر مجہول بین و بکا نہیں کرتا بلکہ ایک خطبۂ میت دے رہا ہے جس سے تھکی ہاری سپاہ اور ساتھیوں کا عزم نئے سر سے بیدار ہوتا ہے۔ مسدس سے قطع نظر حالیؔ کی شکوہ ہندی میں بصیرت رکھنے والوں کو وہ چیز نظر آئے گی جو مسلمانوں سے نہیں انسانیت سے اوجھل ہو گئی تھی، حالیؔ نے مسلمانوں کے زوال کو انسانوں کا زوال بتایا ہے۔ حالیؔ نے مسلمانوں کے جن فضائل کے زوال کا ماتم جس خلوص اور سطوت حزیں سے کیا ہے اُس نے شکوہِ ہند کو دنیائے ادب کی عظیم المرتبت المیہ کے بہت قریب کر دیا ہے۔

حالیؔ اور اکبرؔ کا زمانہ ایک ہے لیکن دونوں کی شاعری کے حدود مختلف ہیں۔ حالیؔ کے تدنظر اسلام اور مسلمان ہیں اکبرؔ مشرق اور مشرقیت کے نمائندہ ہیں۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو مغربیت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہتے دیکھتے ہیں اور اپنی جیسی کر گذرتے ہیں۔ اکبرؔ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اُن کو مغرب میں کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی۔ وہ مغرب سے ناواقف تھے۔ وہ مغرب کی سطحی باتوں کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ قدیم کو ہر اعتبار سے مقدم جو محترم گردانتے تھے۔ وہ عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے اور انگریزی تعلیم بھی پسند نہ کرتے تھے۔

لیکن اکبر جس زمانہ میں تھے اُس میں ہمارے بڑے سے بڑے صاحب فکر و نظر یورپ کی اس نعمت سے مرعوب تھے جو اکبر کو نظر آتی تھی - اُس زمانہ کی مقتدر تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ اور تو اور ہم اپنے مذہب کو بھی اسی حد تک برحق یا قابلِ اعتبار سمجھتے تھے جس حد تک اُس کی سند جواز مغرب کے اعمال و افکار میں ملتی تھی - اُس زمانے میں بھی اکبر مغرب سے مرعوب نہ ہوئے تو کسی نہ کسی حد تک اُن کی بڑائی تسلیم کرنی پڑے گی - پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ لوگ جو مغرب سے پورے طور پر آشنا ہیں اُن میں کتنے ایسے ہیں جو آج بھی اسی دیار اکبر میں یورپ کی بڑائی ہر شعبۂ حیات میں تسلیم کرتے ہیں -

اکبر کی مصطلحات شاعری ذرا ہریجن قسم کی ہیں - ان کے بدھوبانق تنقیدی برہمنوں کو نہیں بھاتے اکبر سیدھی بات بہت جلد بغیر کسی ہیر پھیر کے کہہ دیتے ہیں - اس سے شعر و ادب کے "اشراف و ثقات" گھبراتے ہیں یہ رد یہ یا نقطۂ نظر تنقید کی شریعت میں جائز نہیں رکھا گیا ہے - پھر ہر شاعر کو اختیار ہے چاہے وہ کل سے جز کا استنباط کرے چاہے جز سے کل کا - اکبر ہی نہیں کوئی بڑا شخص یا شاعر کولیش منسٹری نہیں بنا سکتا - اس کے ہاں مفاہمت نہیں ہوتی - یعنی "یہ بھی درست اور وہ بھی درست نہیں" شاعر کا یہ ٹکنیک نہیں ہوتا - یہ کام ہمارا آپ کا ہے کہ ہم شاعر کو جریب اور ترازو سے ناپنے کے بجائے اس کو سمجھنے اور جانچنے کے لئے ذوق ذہانت سے کام لیں -

حالی کے زمانے میں ہونے کے باوجود نفسیاتی ترقی کے اعتبار سے اکبر ایک طور پر حالی سے آگے ہیں۔ سودا کی ہجویات سے قطع نظر اکبر ہماری شاعری میں پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ہنسنے ہنسانے میں پہل کی ہے - یہ کام حالی کے عہد میں کسی اور کے بس کا نہ تھا -

صاحبو، میری یہ گفتگو اب تک آپ کو غیر متعلق معلوم ہوئی ہوگی لیکن اقبال کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے ان مقامات سے گذرنا ضروری تھا - گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ اقبال اب اس درجہ پر فائز ہیں جہاں یہ حکم لگانا بے محل نہ ہوگا کہ جو اقبال کا معتقد نہیں وہ خود بے بہرہ ہے - کوئی شاعر یا آرٹسٹ وسیع اور حقیقی معنوں میں شاعر یا آرٹسٹ نہیں ہے، اگر وہ سارے جہان کا شاعر یا آرٹسٹ نہ ہو - آپ اور میں اقبال کو مسلمان شاعر مانتے ہیں اور غلط نہیں مانتے - اور نہ ایسا سمجھنا اقبال ہی نہیں کسی بڑے شاعر کی شان کے منافی ہے - اقبال کو میں انہیں معنوں میں مسلمان شاعر مانتا ہوں جن معنوں میں اسلام کو سارے جہان کا مذہب سمجھتا ہوں -

اگر رحمۃ اللعالمین سارے جہان کے لئے باعثِ رحمت ہیں تو اُن کا نام لیوا، خواہ وہ شاعر ہو یا لیڈر سارے جہاں کے لئے شاعر اور لیڈر ہو گا۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ ہم میں آپ میں جو لوگ اقبالؔ سے ناواقف ہیں یا اقبالؔ کے قائل نہیں ہیں وہ نہ صرف غیر تعلیم یافتہ ہیں بلکہ غیر متمدن بھی ہیں۔ وہ شخص یقیناً تعلیم یافتہ یا متمدن نہیں کہا جا سکتا جو آفاقی شعرا یا آرٹسٹ کی عظمتوں سے ناآشنا ہو۔

شاعر، مفکر اور رہبر کی حیثیت سے اقبالؔ کو ہمارے ادب اور زندگی میں وہ درجہ حاصل ہے جو آج تک مسلمانانِ ہند میں کسی اور شاعر مفکر یا ادیب کو حاصل نہیں ہوا، فرداً فرداً ممکن ہے ہمارے بعض شعرا کا پایہ اقبالؔ سے برتر ہو لیکن بحیثیت مجموعی اقبالؔ ہمارے اُردو شعرا میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک نامعلوم طویل مدت تک اُردو شاعری میں اقبال کی حیثیت خاتم الشعرا کی رہے تو تعجب نہیں، مذہب ہی نہیں شاعری میں بھی نبی اکثر گذرے ہیں اور گذرتے رہیں گے۔ رسول کم ہوئے ہیں۔

صاحبو، جب اقبالؔ نے اپنا کلام و پیام ملک کے سامنے پیش کیا اور یہ ہمارے آپ کے سامنے کی بات ہے تو ہر طرف سے مخالفت کا طوفان اُٹھا لیکن اُن کی زندگی ہی میں وہ وقت بھی آگیا جب ہم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اقبالؔ کا قائل نہ ہو۔ ہم اُن کے کلام کو صوری و معنوی ہر صورت سے سراہتے ہیں اور اُن کو سب سے بڑا شاعر اور مفکر گردانتے ہیں۔ دنیا کی بڑی ہستیوں کی ایک بڑی پہچان یہ بھی ہے کہ ابتدا میں اُن کی شدید مخالفت کی جائے اور آخر میں اُن پر جان نثار کی جائے۔ اُردو میں ایک سے ایک بڑا شاعر مانا جاتا ہے مگر ہمارے ذہنوں پر اقبالؔ کی جو اَملکیر گرفت ہے وہ کمتر کسی کے حصہ میں آئی۔ یہانتک کہ ہم میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اقبالؔ کو خاصانِ خدا کے زمرہ میں شمار کرتے ہیں۔

اُردو شاعری میں فکر کا عنصر سب سے زیادہ غالبؔ کے ہاں ملتا ہے۔ اُردو میں غالبؔ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شاعرانہ جذبہ میں مفکرانہ گہرائی پیدا کی۔ اِس کا اعتراف خود اقبالؔ نے کیا ہے۔ غالبؔ کے عجمی تصورات سے یہاں بحث نہیں کہنا صرف یہ ہے کہ فلسفیانہ مسائل کو فلسفیانہ شاعرانہ انداز میں پیش کرنے کا سہرا غالبؔ کے سر ہے۔ بعض غزلوں یا اشعار سے قطع نظر غالبؔ کی زبان جہاں کہیں اُنھوں نے فکر و فلسفہ کو دخل دیا ہے علمی زبان بن گئی ہے۔ معتقدانہ شاعرانہ انداز میں شاعری کرنے کا امتیاز انیسؔ و محسنؔ کو حاصل ہے گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ

مرثیہ نگاروں میں انیس وہ ہیں جنھوں نے مرثیہ کے زور سے اپنی شاعری کو نہیں بلکہ اپنی شاعری کے زور سے مرثیہ کو چمکایا زبان کے اعتبار سے انیس کو جو درجہ حاصل ہے وہ مسلم ہے لیکن یہاں اِس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ اُردو بیشتر شاعرانہ زبان رہی ہے اِس لئے ایسی شاعری میں جہاں خیالات سے زیادہ جذبات کی کارفرمائی ہو یہ خوب کام دیتی ہے اور یہی سبب ہے کہ جب کبھی اِس میں ایسے عناصر داخل کئے گئے جو خالص شاعرانہ نہ تھے تو یہ ناہموار نظر آنے لگی، ایسی ناہموار کہ اُس کے پرستار اُس شاعری کے بھی قائل نہ رہے جس نے اس میں اپنا کلام پیش کیا غالب اور حالی کا یہی حشر ہوا۔

صاحبو، اقبال کو بھی اس منزل سے گذرنا پڑا انیس کا یہ کمال تھا اور مرثیہ کی خوش بختی کہ انیس نے مرثیہ میں وہ ساری خوبیاں جمع کر دیں جو دیگر اصناف سخن میں علیحدہ علیحدہ موجود تھیں۔ ان کے کلام میں غزلی قصیدہ، مثنوی، مرثیہ حتیٰ کہ ڈراما اور افسانہ سب کے خصوصی امتیاز بڑے دلکش اسلوب میں سمائے ہوئے ملتے ہیں۔ میر کے بعد انیس کو زبان پر جو قدرت تھی وہ آج تک نہ دیکھی گئی نہ سُنی گئی۔ اقبال کی زبان کا بھی یہی حال ہے۔ میر و انیس کے مقابلہ میں آپ اقبال کی زبان کو شاید ناقابل التفات سمجھیں لیکن یہاں زبان سے مراد صرف روزمرہ اور محاورہ اور اس قبیل کی باتیں نہیں ہیں بلکہ وہ زبان مدنظر ہے جو شاعر نے اپنے کلام میں مخصوص ضرورتوں کی بنا پر اختیار کی ہے اور کامیاب یا ناکامیاب رہا ہے۔ اِس سلسلہ میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ اگر آپ اِس پر غور کریں کہ اقبال کا موضوع سخن کیا ہے اُن کا انداز تخاطب کیا ہے۔ اُن کی ذہنی پرداخت کیسی اور ذہنی پرواز کس طرف تھی۔ اُن کا مقصد کیا تھا اور اُن کے مخاطب کون ہیں تو آپ اقبال کی زبان کے قائل ہو جائیں گے مجھے تو اکثر محسوس ہوا ہے کہ جہاں تک مسائل علمیہ و فکریہ کو شعر میں ڈھال کر دلنشین اور فکر انگیز بنانے کا تعلق ہے غالب کی زبان سے اقبال کی زبان زیادہ متوازن و شگفتہ ہے گو یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ اِس وادی کے کانٹے نکالنے کا کام غالب ہی نے کیا اور اِس طرح اقبال کے لئے زمین ہموار اور صاف ملی۔ روزمرہ اور عام بول چال کی زبان سے یہاں بحث نہیں۔ اقبال کے ہاں اس زبان کا گزر نہیں، البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال نے فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو جس ماہرانہ و شاعرانہ انداز سے اپنے اُردو کلام میں منتقل کیا ہے اِس سے ہندوستان میں اُردو اور فارسی دونوں کا وزن و وقار بڑھ گیا۔

صاحبو، اُردو شعرا میں ایسے اصحاب بھی نظر آتے ہیں جو شاعری کے علاوہ دوسرے علوم و فنون پر بھی قدرت رکھتے تھے لیکن اِس کا اثر اُن کی شاعری پر بہت کم نظر آتا ہے، بعض شعرا علمی و فنی مصطلحات کی رعایت اپنے

کلام میں مدنظر رکھتے ہیں۔ ہم اپنے حسن ظن سے ان کو اس علم و فن کا امام قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ جو لوگ شعرا اور نثار دار کے ہتھکنڈوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی رعایات و مناسبات کا فن کے جاننے سے دور دور تک کا تعلق نہیں۔ یہ سارا کرشمہ ضلع جگت یا رعایات لفظی کا ہے جو ایک زمانہ میں ہمارے شعر و ادب اور روزمرہ کی صحبتوں میں بہت مقبول رہے یہی حال بڑی حد تک اردو شاعری میں تصوف کا ہے۔ اردو میں ایسے شعرا بہت کم گزرے ہیں جو واقعتاً تصوف سے لگاؤ رکھتے تھے یا جنھوں نے تصوف کا مطالعہ کیا ہو یہی سبب ہے کہ ہم کو اردو شاعری میں زبانی کھیل زیادہ ملتا ہے۔

صاحبو، ہم میں ایک غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ شاعری میں جذبہ ہی سب کچھ ہے۔ میں ایسے جذباتی شعرا سے واقف ہوں جو جذبہ کو خدا کی سب سے بڑی دین اور اپنا سب سے بڑا سرمایۂ افتخار گردانتے ہیں، جذبہ کو میں بھی خدا کی بہت بڑی دین سمجھتا ہوں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ وہ ہمارے شعرا کی شامت بھی بن گیا ہے۔ اگر غور فرمائیے تو معلوم ہو جائے گا کہ جذبہ بجائے خود کوئی بڑی بات نہیں ہے اگر اس کو حرکت میں لانے اور صحیح راستہ پر لگانے کا ملکہ فکر و تجربہ نے شاعر کو نہ عطا کیا ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ایک متنازعہ فیہ مسئلہ کی بھی ابتدا ہوتی ہے یعنی اقبال شاعر ہیں فلسفی ہیں یا ان کی شاعری پر فلسفہ غالب ہے۔

میرے نزدیک اس سوال کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اقبال کا درجہ (اور برگزیدہ شاعر کا درجہ) اس بحث سے کہیں بلند ہے کہ وہ شاعر پہلے ہیں فلسفی بعد میں یا اس کے برعکس۔ بحیثیت مجموعی، شاعری میرے نزدیک مخصوص پیرایۂ اظہار ہے نہ موضوع بحث، تمیز ہو تو فلسفہ، سائنس، منطق وغیرہ کو بھی شاعری کا رنگ و آہنگ دیا جا سکتا ہے اور سلیقہ نہ ہو تو حسن و عشق کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ چنانچہ میرے نزدیک اقبال کا شاعر ہونا ان کے فلسفی ہونے کا منافی نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے مفکر یا فلسفی ہونے سے ان کی شاعری کی منزلت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ہمارا شاعرانہ اور رسمی شاعری کا چسکا ہم کو غزل سے پڑا۔ یہاں تک کہ اکثر ہم غیر شعوری طور پر بھی یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ شاعری عبارت ہے غزل سے بعضوں کا خیال ہے کہ شاعری اور تغزل مترادف نہ سہی ان کا چولی دامن کا ضرور ساتھ ہے۔ شاعری کا یہ تصور اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ اس سے ہمارے تمدنی مزاج کی غمازی ہوتی ہے یعنی حسن و عشق تمامتر عبارت ہے عورت کے حسن سے اور عورت کے عشق سے!

اقبال کا حسن و عشق اس سے علیحدہ بھی ہے بلند بھی ہے اور شاید اس کا منافی بھی۔ لیکن اس بحث کو کسی دوسرے موقع کیلئے ملتوی کر دینا مناسب ہوگا میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اقبال کی عظمت کی نشانی ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کلام میں شاعر اور مفکر دونوں نظر آتے ہیں مفکر اگر شاعر نہ ہو تو ممکن ہے ہم اس کی بات سمجھ لیں یہ البتہ دشوار ہوگا کہ ہم اس کے کہے پر عمل بھی کریں اسی طرح شاعر نہ ہو تو ممکن ہے ہم شاعر میں واہ واہ کر لیں تنہائی و تکلیف میں وہ ہمارا مونس و رہبر نہ بن سکے گا اردو شاعری میں خالص شاعر بھی گذرے ہیں۔ ان کی شاعری کو ہم اچھی شاعری بھی کہہ سکتے ہیں البتہ بڑی شاعری نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے ہاں اچھے شاعر بہت سے گذرے ہیں بڑے شاعر یقیناً بہت کم ہیں۔

صاحبو، اردو شاعری میں صرف اقبال کی شاعری ایسی ہے جو ہم کو اُن علوم و مسائل تجربات و تحریکات کی طرف بے اختیار متوجہ کرتی ہے جو اس وقت عالمگیر ہیں اور جن کی گرفت عام اور تعلیم یافتہ ذہنوں پر ہے۔ انھوں نے دنیا کے اکابر اصحاب فکر و عمل کے خیالات تعلیمات و جدوجہد کو اپنے کلام کے ذریعہ اس شاعرانہ لطف و نزاکت اور عالمانہ بصیرت و سنجیدگی سے پیش کیا کہ ہم کو ان اصحاب فکر سے ایک طرح کا ذہنی ربط پیدا ہو گیا، اور اس طور پر ہم نہایت آسانی کے ساتھ ان تمام عالمگیر ذہنی تحریکوں سے آشنا ہوئے جن سے کسی اور طرح ہمارے عامۃ الناس روشناس نہ ہو سکتے تھے۔ شاعری کا بڑا کمال اور اس کے لئے سب سے مستند سند جواز یہ ہے کہ وہ مشکل گہرے اور نازک تصورات و خیالات کو بہت حد زیادہ سے زیادہ دلوں میں اُتار دیتی ہے اور یہ وہ کارنامہ ہے جو شاعری کے علاوہ کسی اور فن کو نصیب نہیں۔ اردو شاعری میں یہ بات صرف اقبال کے ہاں ملتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اقبال نے ان افکار و تحریکات کی خوبی اور خامیوں کو اسلامی افکار و اعمال کی روشنی میں اس طرح پیش کیا جس سے ہمارے خواص و عوام دونوں گمراہ ہونے کے بجائے بہرہ مند ہوئے۔

سیاسی لیڈر تو ہم میں پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن ذہن و فکر کو طاقت و تازگی بخشنے اور صحیح راستہ پر رہنمائی کرنے والا ہم میں عرصہ سے نہیں پیدا ہوا تھا۔ آج کل مادی ترقی کے ساتھ ذہنی ترقی کی جو رفتار ہے اس سے عہدہ برا ہونا معمولی ذہن و دماغ کا کام نہیں ہے۔ آجکل سیاسی قیادت جتنی آسان ہے اتنا ہی ذہنی قیادت مشکل ہے۔ سیاسی قیادت اکثر چند افراد اور محدود مقاصد کی بنا پر حاصل ہو جاتی ہے لیکن ذہنی قیادت ہر صدی میں صرف چند ایک کے حصہ میں آتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں ہمہ گیر ذہنی قیادت بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی۔ یہ سعادت اور برگزیدگی اس صدی

ہیں اقبال کو نصیب ہوئی، اقبال نے زندگی اور زمانے کے تقریباً تمام مسائل پر حکیمانہ شاعرانہ یا شاعرانہ حکیمانہ انداز سے اظہار خیال کیا ہے اور کچھ ایسے دلکش اور موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ ہم میں ہر شخص خواہ وہ اس کے سمجھنے کی کافی استعداد رکھتا ہو یا نہیں ان مسائل کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کامیاب ہوتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور نہیں کامیاب ہوتا ہے تو کامیاب یا مطمئن ہونے کی بار بار کوشش کرتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اقبال کے وسیلہ سے قوائے علمیہ و عملیہ کس طرح بیدار و بالیدہ ہوتے ہیں۔ اقبال کے کلام کی مثال اس متاع یوسفی کی ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے مصر کے اہل ثروت و اقتدار ہی نہیں بلکہ ایک بڑھیا بھی تھوڑی سی روئی لے کر بازار مصر میں آموجود ہوئی تھی۔ آپ سوچیں تو معلوم ہوگا کہ اقبال کی اس کرامت کا عام ذہنی نشو و نما اور ذہنی حوصلوں پر کیسا عظیم الشان اثر ہے۔

صاحبو، اسلام نے اپنے پیروؤں کو دین و دنیا کی ان منزلتوں پر فائز کر دیا تھا جن سے آگے یا جن سے بڑی کوئی اور منزلت نہ تھی۔ دنیا کی کوئی ترقی یا ذہن و عمل کا کوئی کارنامہ ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کو سراسیمہ یا متحیر کر سکتا۔ مسلمانوں پر ایسا وقت بھی آیا جب وہ منزلت سے گر کر ذلت میں جا پڑے اور اس تصور نے کہ وہ سب کچھ تھے یا کر سکتے تھے لیکن کرتے کچھ نہ تھے ان کو شدید نقصان بھی پہنچایا، یہ سب ہمارے آپ کے سامنے کی باتیں ہیں۔ ہم نے ہر طرح کے جتن کئے لیکن شعور کی وہ بیداری جس کو ہم افراد کی نہیں جماعت کی بیداری سے تعبیر کر سکتے مدتوں نصیب نہ ہوئی۔ مغربی اداروں اور مغربی افکار سے ہم مسحور و مرعوب ہوتے رہے۔ یہ حال عوام ہی کا نہیں تھا بلکہ ہمارے خواص بھی اس کے شکار تھے۔ ہماری اکثر مستند تصانیف اور بیشتر ادارے اس پر گواہ ہیں۔ اقبال کے کلام کی گرمی اور تازگی ان کی تعلیم کی گیرائی اور گہرائی اور ان کے بے پایاں خلوص سے ہمارے دلوں کے معلوم نہیں کب سے خشک سوتے ابل پڑے اور کتنے سوئے ہوئے ساز نغمہ سرا ہو گئے۔ ہندی مسلمانوں میں جو ہمہ جہت بیداری آج نظر آ رہی ہے اس کو جو نام چاہئے دے لیجئے، یہ کرامت اقبال ہی کی ہے جس کے لئے امین و غالب حالی و اکبر سرسید و شبلی نے زمین ہموار کر رکھی تھی۔

صاحبو، اقبال سے پہلے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کو واجب العمل سمجھنا تو درکنار ان کو تحریر و تقریر میں بطور سند پیش کرنا اپنی اور دوسرے کی ذہنی توہین سمجھتا تھا۔ یہ طبقہ اسلاف و اکابر کی روایات اور

مذہبی و اخلاقی قدروں پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ اُردو شعر و ادب کو دوسرے شعر و ادب کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتا تھا ہر وہ چیز جو مغرب سے آئی ہو مستند اور مشرق کا ہر تصور و تصویر مردود تھی۔ اِقبال کے کلام و پیام نے ہمارے قلب و دماغ کی یکسر قلب ماہیت کر دی، اَب کسی بحث میں اقبال کا کلام یا اُن کے متفرق اشعار کو بطور دلیل پیش کرنا عام بات ہے۔ بعض فروعی باتوں سے قطع نظر اقبال نے وہی چیزیں پیش کی ہیں جو پہلے سے ہمارے ہاں موجود تھیں لیکن نیا ذہن اُن کی طرف مائل نہ ہوتا تھا۔ اِقبال کی تعلیم کی بنیاد قرآن، حدیث، ائمہ کے اقوال اور اسلاف کے کارناموں پر مشتمل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اقبال نے ان باتوں کو جس قابلیت خلوص اور جرأت کے ساتھ پیش کیا اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم خود اپنی نظروں میں محترم ہو گئے، اور اس طور پر محترم بنے کہ دوسرے ہم کو محترم ماننے پر مجبور ہوئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری اور پیمبری کی حدود نہ صرف ایک دوسرے سے مل گئی ہیں بلکہ کچھ دور تک ایک ساتھ چل گئی ہیں۔

صاحبو، ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اقبال کو مفکرین یورپ کا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں۔ یہ غلطی نہیں تو غلط فہمی ضرور ہے۔ یہی نہیں بلکہ آج کل بعض حلقوں میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ خود اسلام اپنے پیشرو مذاہب سے ماخوذ ہے یا اُن کا خوشہ چیں ہے، اسی سلسلہ میں ایک بات یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اقبال نے جو بات کہیں بھی مفید مطلب پائی اختیار کر لی اور باقی کو ترک کر دیا یہ سارے اعتراضات تسلیم کر لینے چاہئیں۔ یہ اعتراضات بڑی حد تک اسلامی تصورات کی تصدیق کرتے ہیں نہ کہ تکذیب، واقعات صحیح ہیں صرف اُن سے نتیجہ غلط نکالا گیا ہے۔ اسلام نے اس کا کہیں اور کبھی دعویٰ نہ کیا کہ وہ دنیا کی تاریخی و تمدنی آثار و کسر انکسار سے یکسر محفوظ و علیحدہ رہ کر ایک دن یک لخت آسمان سے نازل ہو گیا۔ وہ جملہ دوسرے ادیان کا ناسخ بھی ہے اور تصدیق کرنے والا بھی۔ ناسخ اِس لئے کہ اسلام دین کامل قرار دیا گیا اُس ہستی کے توسل سے جو اسلام کا مرد کامل ہے اور اِس طاقت نے اُس کو کامل قرار دیا جس سے بڑی طاقت انسانی تصور میں نہیں آسکتی۔ اور تصدیق کرنے والا یوں کہ وہ اُن ادیان کو جھٹلاتا نہیں بلکہ ان کے بنیادی تصورات کی تصدیق کرتا ہے۔ اِس لئے اِسلام میں اگر وہ باتیں ملیں جو اِس سے پہلے کے ادیان میں ملتی ہیں تو اس میں شرمانے، خفا یا مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ اِس سے اسلام کا درجہ فرد تر کیونکر ہوا؟ کلام الٰہی یا مذہب الٰہی کے یہ معنی کب ہوئے کہ دنیا کے حالات و حوادث سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، بذاتِ خود میں سمجھتا ہوں کہ اِس دنیا کا خدا اسی دنیا کے ماضی حال و مستقبل سے بیگانہ نہیں ہے اِس لئے کہ دُنیا کی تاریخ تقدیر الٰہی سے باہر نہیں۔

صاحبو، اِس بحث کی روشنی میں اگر ہم یہ مان لیں کہ اقبالؔ نے مفکرینِ یورپ سے استفادہ کیا تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے اور اقبالؔ نے مفکرینِ یورپ کی انہیں باتوں سے سروکار رکھا ہو جو ان کے کلام و پیام کی تائید و تصدیق کرتے ہوں (بقیہ سے نہیں) تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کو اِس مسئلہ پر بھی غور کرنے کی دعوت دوں گا کہ مفکرینِ یورپ کے اکثر بنیادی تصورات ان اسلامیوں کے تصرفات ہیں جو براہِ راست یا بالواسطہ یورپ پہنچے تو یورپ کے مفکرین کے بارے میں آپ کیا رائے قایم کریں گے۔ یہ بحث بڑی طولانی ہے۔ اِس صحبت میں مَیں صرف اقبالؔ کو مدِنظر رکھنا چاہتا ہوں۔ اقبالؔ نے اِس کا اعتراف کیا ہے کہ ان پر فلاسفۂ مغرب کا کافی اثر تھا لیکن اِس کے ساتھ اقبالؔ نے اِس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ مغربی مفکرین کے مُطالعہ سے پہلے وہ ان اِسلامی تصورات و عقائد سے بھی پورے طور پر بہرہ مند تھے جو کلام پاک کے مُطالعہ کا نتیجہ تھے، میرے نزدیک اِن دونوں بیانات میں تضاد نہیں ہے کیا اِس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اقبالؔ مغربی مفکرین سے متاثر ہی اِس لئے ہوئے کہ اُن کے ذہن و دِماغ میں وہ اِسلامی تصورات رچے ہوئے تھے جو انسانی ذہن و عمل کو اِنسانی ارتقا کی اس وادی سے لے جاتے ہیں، جس کا ایک سرا میلادِ آدم سے وابستہ ہے اور دوسرا معراجِ آدم میں پوشیدہ۔

صاحبو، اِس بحث میں گفتگو کی بڑی گنجائش ہے لیکن وقت میں گنجائش نہ ہونے کے سبب سے میں اِس مسئلہ کو یہاں ختم کر دینا چاہتا ہوں اور اپنے اُن نوجوان دوستوں کو جو اقبالؔ کا مُطالعہ کرنا چاہتے ہیں مشورہ دوں گا کہ وہ اقبالؔ کے بنیادی تصورات کو ذہن میں رکھ کر کلام پاک کا مطالعہ کریں۔ اِن کو معلوم ہو جائے گا کہ اقبالؔ پر قرآن کا اثر مغربی مفکرین کے اثر سے کہیں زیادہ نمایاں ہے اور اقبالؔ کو مغربی مفکرین کے تصورات سے دلچسپی ہی اِس لئے پیدا ہوئی کہ اُن کے تصورات کلامِ الٰہی سے ہم آہنگ ہیں اور اقبالؔ ان مفکرین کے اُسی حد تک ہمنوا ہیں جس حد تک قرآن پاک سے اُن تصورات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ہمارے ایک عزیز و ذی استعداد طالب علم نے اس پر کام کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ کچھ تعجب نہیں آئندہ سال یومِ اقبالؔ کے موقع پر سرورِ صاحب کی معرفت آپ طالبِ علم کے اس مقالہ سے اُسی ایوان میں آشنا ہوں۔

بعضوں کے نزدیک اقبالؔ کے ہاں جہاں تہاں منطقی اُلجھنیں ملتی ہیں۔ خودی اور خدائی کے حدود واضح نہیں ہیں۔ فوق البشر کا تصور کہیں کچھ ہے اور کہیں کچھ۔ وہ کبھی کسی ادارہ یا شخصیت کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی اس سے

روگرداں ہو جاتے ہیں اور اِس قبیل کی دوسری باتیں - لیکن یہ اُمور ایسے نہیں ہیں جن کی اہمیت اقبال کی عظمت پر غالب آسکے - جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اِس دُنیا میں خدا کی قدرت کا سب سے بڑا اور نمونہ اِنسان ہے اور اِنسان ہی وہ باشعور مخلوق ہے جو باعتبار خلقت اپنے خالق سے بہت قریب کا رشتہ رکھتا ہے اور یہ رشتہ "زندگی" کا ہے اس زندگی کا جو ہمیشگی سے پیوستہ ہے جو اوجھل ہوتی رہتی ہے معدوم نہیں ہوتی یہ زندگی خدا سے شروع ہوتی ہے اور خدا ہی پر ختم ہوتی ہے، اِنسانی زندگی کبھی اِس سے باہر نہیں ہو سکتی - میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی خودی ہمیشہ انسانی خودی رہے گی اور اس کی خودی کی معراج اس پر نہیں ہے کہ وہ خدا بن جائے بلکہ خدا کی صفات سے قریب تر ہو کر مرفع تر و مستحکم تر ہوتی رہے - اِنسان کے خدا بن جانے میں میرے نزدیک اِنسان کی کوئی بڑائی نہیں ہے اِس لئے کہ اِنسان کا خدا بن جانا انسانیت کے مقاصد میں نہیں ہے - استحکام خودی سے اقبال کا مقصد یہی ہے کہ وہ کسی ذات میں ضم نہ ہو - انسانی خودی کی اِنتہا صرف اِنسانی خودی کی انتہا ہے کسی اور کی ابتدا یا انتہا نہیں -

صاحبو! یہ مسائل علمی نقطۂ نظر سے اہم ہوں تو ہوں مذہبی نقطۂ نظر سے اِن کی کوئی اہمیت نہیں اس لئے کہ مذہب اِس بحث سے بلند بھی ہے اور علیحدہ بھی - دراصل اسلام میں کوئی فلسفہ نہیں ہے - اسلام کا مدار چند بنیادی عقائد پر ہے اِس کے بعد اِن عقائد کے ماتحت تمامتر عمل پر ہے - بذاتِ خود میں سمجھتا ہوں کہ عقائد کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ وہ سائنس، فلسفہ اور ریاضی کی کسوٹی پر صحیح اُتریں، عقائد کا مستحکم ہونا ضروری ہے - سائنٹیفک ہونا بالکل ضروری نہیں ہے - فلسفہ دراصل مذہب کا گورستان ہے - دُنیا کے مذاہب پر جو زوال آیا وہ غالباً اسی سبب سے ہے کہ ان میں فلسفہ کے جراثیم موجود تھے - اگر اسلام مذہب عمل نہ ہوتا تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شخصیت کو اِس درجہ اہمیت نہ دی جاتی - رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ سے شجر اسلام میں نمو و نمو ہے - یہی سبب ہے کہ اسلام پر بُرے سے بُرا وقت آیا لیکن اُس پر کہولت یا فرسودگی طاری نہ ہوئی - اِنسانی جہد و عمل کا مذہب کبھی فرسودہ نہیں ہوا - درسِ خودی میں اِقبال اِسی جہد پیہم پر زور دیتے ہیں جس میں "محبت فاتح عالم" بھی شامل ہے -

رہا یہ مسئلہ کہ اِقبال کے بیانات میں تضاد ملتا ہے اِس کے بارہ میں صرف یہ کہنا کہ اِسلام کے خدا کی طرح اسلام اور اسلام کے شاعر میں بھی مختلف حیثیتیں مختلف مواقع پر برسرِ کار آتی ہیں - اِسلامی سیرت و شخصیت میں "پولاد" و "پرنیاں" دونوں ملتی ہیں - ضربت کاری بھی دلنوازی بھی! لیکن اِس بحث کو یہاں ختم کر دینا چاہئے - بہت ممکن ہے آج کی

صحبت میں کسی گوشہ سے اُن پر تفصیلی گفتگو سُننے میں آئے۔

صاحبو، میں نے اِقبال کا کلام پڑھا ہے بار بار پڑھا ہے ہر حال میں پڑھا ہے ہر موقع پر پڑھا ہے، (پھر بھی سرور صاحب سے کم پڑھا ہے) مجھے ہمیشہ کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اقبال کا کلام اُس آسمان کی مانند ہے جس کے نیچے ہم آپ بستے ہیں۔ جاڑے گرمی برسات میں اس فضائے نیلی پر کیسے کیسے سماں نظر آتے ہیں جو کبھی یکساں نہیں ہوتے جن میں زندگی کی بوقلمونی نظر آتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو برسات میں آپ نے دیکھا ہوگا۔ اِس بساط پر کیسی کیسی نیرنگیاں نظر آتی ہیں اور آپ کے ذہن میں کیسی کیسی رنگین پُر اسرار ڈرانے والی، تسکین دینے والی، حوصلہ دلانے والی تصویریں اور تصورات، جیسے جیتے جاگتے ہنستے بولتے "دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من" جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے کشمیر کی زمین و آسمان جن کو جب دیکھئے جتنا دیکھئے جس حال میں دیکھئے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور محسوس ہوگی جو پہلے نہ ہوئی تھی۔!

صاحبو، آپ کو یاد ہوگا میں نے عرض کیا تھا کہ اقبال کا کلام و پیام ہماری زندگی کی سرگرمیوں میں غیر معمولی طور پر دخیل ہے۔ اقبال کے کلام و پیام سے مسلمانانِ ہند میں ایک جدید نشاط الثانیہ کی ابتدا ہوئی ہے، ہماری زندگی کا کونسا شعبہ ایسا ہے جہاں اقبال کے کلام و پیام سے ہم کو مکمل رہبری نہیں ملتی، ان کے فلسفہ نے نئے علم کلام کا دروازہ کھولا، شعر و ادب میں نئی قدریں سامنے آئیں، تعلیمی مسائل میں اقبال کے کلام سے روشنی اور گرمی دونوں ملتی ہیں، ہمارے آپ کے پروفیسر سیدین نے کچھ دن ہوئے ایک مبسوط تصنیف میں اقبال کے اُن نظریوں کو پیش کیا ہے جو تعلیم کی اساس مانے جاتے ہیں، ہماری موجودہ سیاسی تگ و تاز میں اِقبال کے کلام کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جماعت کی شیرازہ بندی میں اقبال کی تعلیم نے وہ کام کیا جو ابتک پورا نہ ہوا تھا، اِقبال ہی کے تصرف سے ہم کو اپنے علمی و تمدنی ورثہ کی عظمت کا احساس ہوا اور قومی شعور کی صحیح رستہ پر نشو و نما ہوئی، اقبال کے کلام و پیام سے مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ اور حضرت اسمٰعیل شہید کے کارناموں کو از سرِ نو تازگی و تابندگی ملی۔

ہمارے ادب میں اتنا جامع حیثیات شاعر ابتک نہیں پیدا ہوا جو بیک وقت اپنی قوم میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا معلم و مفکر تھا۔ اُس کی یادگار منانا اور اُس کے بتائے ہوئے راستہ کو اختیار کرنا سعادتمندی بھی ہے اور اقبالمندی بھی۔ خدا آپ کی مدد کرے۔

خطوط میں شخصیت کا اظہار

از
(آل احمد صاحب سرور، ایم، اے، بی، ایس سی پرنسپل رضا کالج رامپور)

اقبال کا یہ شعر تو آپ نے سنا ہوگا۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت ✽ معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اقبال کے نزدیک آرٹ میں جان خونِ جگر سے آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں خلوص اور ریاض کی آرٹ میں بڑی اہمیت ہے، مگر خلوص اور ریاض سے آپ دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں، انہیں زیادہ دیر تک ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ اس کے لئے شخصیت کی ضرورت ہے، ہڈسن کا خیال یہ ہے کہ شخصی اور انفرادی تجربہ ہی ادب کی جان ہے۔ حسن، شاعری، سچائی کی طرح شخصیت کی تعریف بھی آسان نہیں، لیکن جب ہم شخصیت سے دوچار ہوتے ہیں تو فوراً پہچان لیتے ہیں۔ ادب میں تازگی، ندرت، سچائی اور زندگی، شخصیت سے آتی ہے، شخصیت کی گرمی سے بے جان الفاظ منہ سے بولنے لگتے ہیں اور اقبال کے الفاظ میں نالۂ نَے میں سرور مے اور شیشے کی صراحی میں شمشیر کی تیزی ملنے لگتی ہے۔ ادب میں شخصیت کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، ادب کی ہر شاخ میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ مگر جس طرح سفید رنگ، نکیلے شیشے میں سے گزر کر کئی رنگوں میں بٹ جاتا ہے، اسی طرح شخصیت بھی ادب کی مختلف شاخوں میں کم و بیش ظاہر ہوتی ہے اور اس سے بعض اوقات اس کا پہچاننا دشوار ہو جاتا ہے۔ ناول اور ڈراما میں شخصیت کا اظہار اور طرح ہوتا ہے، شاعری میں اور طرح، اول تو شخصیت خود ایک رنگ، ایک مزاج، یا ایک کیفیت کی حامل کم ہوتی ہے۔ اس میں خدا جانے کیا کیا نشیب و فراز ہوتے ہیں، دوسرے اظہار کی دشوار گزار وادیوں سے گزرتے گزرتے اس میں میدان میں بہنے والے دریا کی طرح نہ معلوم کیا کیا مل جاتا ہے۔ شعور اور لاشعور کی کیسی کیسی

بھول بھلیاں، تاریخ، تہذیب اور تمدن کی کتنی بھولی بسری یادیں - ملک و قوم اور زمانے کے کتنے نقوش، کتنی سنہری خوابیں اور کتنی تلخ حقیقتیں، اِس لئے ایک اچھا نقاد کسی ایک معیار یا پیمانے پر قناعت نہیں کرتا، وہ کئی چیزوں کو دیکھتا ہے، کتنے نقاب اُسے اٹھانے پڑتے ہیں، تب جاکر حقیقت کا جلوہ نظر آتا ہے بعض اشخاص تو آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں، پہلی ہی نظر میں اُن کی اُفتادِ طبیعت کا اندازہ ہو جاتا ہے، وہ ایک ہی کتاب یا نظم میں اپنی روح کو بے نقاب کر دیتے ہیں، لیکن بعض ایسے چکنے ہوتے ہیں کہ ہاتھ میں آتے آتے پھسل جاتے ہیں، اس لئے ہمیں اُن کے ذاتی حالات، روزمرہ زندگی کے واقعات، بے تکلف لمحوں کو دیکھنا پڑتا ہے - خطوں میں اِن سب باتوں کی مصوری ہو جاتی ہے، اِس لئے یہ سچ ہے کہ اُفتادِ مزاج کو سمجھنے کے لئے خطوں کا مطالعہ سب سے زیادہ اہم ہے۔

مولوی عبدالحق نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "خطوں میں خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے، اِس میں وہ صداقت اور خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا ..... خطوں سے اِنسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا" یہ خیالات بڑی حد تک صحیح ہیں گو یہ بات نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ جب خط اشاعت کے لئے یا اشاعت کو ذہن میں رکھکر لکھے جاتے ہیں تو وہ خلوص اور بے ریائی جو اُن کی جان ہے، بعض اوقات مدھم پڑ جاتی ہے۔

خط کیا ہیں، بقول غالب کے جو بات پاس کے لوگوں سے کی جاتی ہے اُسے دُور کے لوگوں تک پہنچانا گفتگو کو تحریر کا، مکالمے کو مراسلے کا جامہ پہنانا۔ اچھا خط وہ بنایا جاتا ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا نظر آئے، جس میں بے تکلفی، بے ساختگی، خلوص، فطری رنگ، اِنفرادیت، ذاتی تاثرات کی جھلک ہو، چنانچہ وہ خط جن میں جان بوجھکر انشا پردازی کی شان، علمیت کی نمائش، تکلف کا اظہار، خطابت کا جوش دکھایا جائے خط نہیں مضمون ہیں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ بعض طبیعتوں پر ایک رنگ اسقدر غالب ہو جاتا ہے کہ خط میں بھی وہی چیز نمایاں رہتی ہے، چنانچہ لیلیٰ کے خطوط، خط نہیں مضمون ہیں، یہ انشائے لطیف کا چمن ہیں، ان میں لکھنے والے کے تاثرات جا بجا جلوہ گر ہیں۔ مگر یہ خط نہیں، خطوں کے اسلوب اور فارم سے ان میں فایدہ اٹھایا گیا ہے۔ اِسی طرح غدر سے پہلے خط لکھنے کا جو دستور تھا، وہ رسمی، پر تکلف اور نمائشی تھا۔ جسے دیکھو بجھا جاتا ہے، بات کم کرتا ہے، سات تسلیمیں زیادہ جذبات

کی اِس قدر نمایش ہے کہ خلوص غایب۔ سب خط ایک سے ہیں، سب سے ایک طرح کی عقیدت یا شفقت کا اظہار ہے صرف تھوڑا تھوڑا سا فرق ہے۔ یہ ہمارے تہذیبی مزاج کا خاصہ تھا جو اِنفرادیت کو گوارا نہ کر سکتا تھا۔ جو سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتا تھا اور الفاظ کے زور سے اپنا لوہا منوانا چاہتا تھا۔ ان خطوں سے کسی کی انفرادیت کا پتہ لگانا ایسا ہی ہے جیسا سمندر سے امرت نکالنے کی کوشش، جو دیوتا کر سکتے ہیں اِنسانوں کے بس کی بات نہیں۔

غالب پہلے شخص ہیں جو اپنے خطوں میں اپنی شخصیت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اور اِس شخصیت کا کمال یہ ہے کہ عظمت و سطوت کے بجائے وہ اِنسانیت پر اعتماد کرتی ہے، ایک بت بن کر اپنی پرستش کرانے کے بجائے وہ اِنسان بن کر دلوں میں رہتی ہے۔ غالب کے خطوں ہی میں خطوں کی بیشتر خصوصیات مل جاتی ہیں، فطری اور بے تکلف ہیں۔ اِن میں نمایش اور ظاہر داری مقصود نہیں۔ اشاعت کا خیال بھی غالب کو اپنے ذاتی خواہشات کے اِظہار سے نہیں روکتا۔ پنشن کی تلاش بدستور ہے، چنے پلانے کا تذکرہ جاری ہے، نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں سے عرض مدعا کرتے ہیں، کبھی آشیاں چیدن اور آشیاں بستن کے مسئلے پر صاف صاف گفتگو سے نہیں شرماتے، کبھی یوسف مرزا سے تعزیت کرتے ہیں کبھی میاں داد خاں سیاح کو چلتے چلتے یہ اِطلاع دیتے ہیں کہ اُن کے نام سے ایک صاحب کے اعتراضوں کا جواب چھپوا دیا ہے، غالب کے خطوں سے جو شخصیت سامنے آتی ہے وہ ہر حال میں اور ہر رنگ میں اپنی مثال آپ ہے۔ وہ اپنے کلام پر نازاں اور اپنی قسمت پر ماتم کناں ہے، وہ دُنیا کے اچھے خاصے شعور کے باوجود محض دنیا دار اور زمانہ ساز نہیں ہے، وہ ایک خاص ادبی مذاق کی غماز ہے، مگر محض ادبیت کو اوڑھنا بچھونا نہیں بناتی، غالب کی شاعری سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حالی نے اُنہیں حیوان ظریف کیوں کہا ہے، اُن کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی طبیعت میں ظرافت غالب تھی۔ غالب کے کلام سے غالب کی جو تصویر سامنے آتی ہے، وہ اُس غالب کی ہے جو خیال کی دُنیا میں رہتا تھا، خطوط میں وہ غالب ملتا ہے جس کے قدم زمین پر جمے ہیں جس میں زندگی کرنے کا حوصلہ اور برق سے شمع ماتم خانہ روشن کرنے کا ولولہ ملتا ہے، جو اپنے نام سے فایدہ اُٹھاتا ہے، مگر اپنے فن کو ذلیل نہیں کرتا، غالب کا کمال یہ ہے کہ دونوں تصویروں میں اِختلاف کے باوجود زندگی، اِنفرادیت اور ایک ابدی تازگی ہے۔ غالب آسمان پر ہو یا زمین پر، وہ ہر جگہ منفرد ہے، وہ جس انداز سے مانگتا ہے، دوسرے اس طرح دے بھی نہیں سکتے، غالب اور ناظم کے خط پڑھیے تو دونوں کا فرق واضح ہو جائے گا۔

غالب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، کچھ اُن کی شاعری میں جھلکتے ہیں اور کچھ نثر اور خطوں میں۔ ایک کے بغیر دوسرے کو سمجھنا مشکل ہے۔ یہ غالب کی رنگا رنگ شخصیت کا اثر ہے۔ مگر سرسید اور حالی کے خط ایک وحدت رکھتے ہیں، سرسید کے یہاں ایک ہی رنگ، ایک ہی سُر، ایک ہی جذبہ ملتا ہے، اُن کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز اُن کی دردمندی اور خلوص ہے، اِس وجہ سے اُن کے مضامین میں ایک تاثیر اور خطوں میں ایک رقت ملتی ہے۔ خطوں میں وہی شخصیت جھلکتی ہے جو تہذیب الاخلاق کے کالموں میں، ہم ایک لیڈر، ایک مصلح قوم، ایک معلم اخلاق، ایک سیاسی رہنما سے ہر جگہ دوچار ہوتے ہیں۔ سرسید کے خط غالب کے خطوں کی طرح دلچسپ نہیں ہیں۔ سرسید کے یہاں نہ تو کوئی راز ہے جس سے پردہ اُٹھنے میں دلچسپی ہو، نہ نشیب و فراز ہیں جن سے گذر کر انسان ہمتوں کی پستی اور شوق کی بلندی کا نظارہ کرے۔ وہ انگلستان میں بھی وہاں کی حوروں کو دیکھ کر صرف یہ کہتے ہیں کہ جنت کا ہونا سچ ہے مگر اُن کی قسمت میں وہی قوم کا رونا ہے، سرسید کی دراصل کوئی پرائیویٹ لایف تھی ہی نہیں، اُن کے یہاں یہی قومی خدمت کا جذبہ ہے جو ہر رنگ میں اور ہر جگہ نظر آتا ہے۔ حالی بھی سرسید کی طرح ہیں۔ اُن کے خط بھی دلچسپ نہیں کہے جا سکتے۔ وہ نہ کبھی بہت جوش میں آتے ہیں نہ کسی کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ نہ کسی کو برا بھلا کہتے ہیں، ان کے یہاں ایک یکساں دھیما، سنجیدہ، متین، شریفانہ مہذبانہ اور روشن مزاج ملتا ہے جو دلوں کو اپنی طرف کر لیتا ہے۔ مگر وہ زیادہ دیر تک اُنہیں ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ اُن کے دلوں سے انسانی سیرت کی نیرنگی اور بوقلمونی پر روشنی نہیں پڑتی، اُس کی عظمت کا نقش ضرور ہوتا ہے۔

ہاں شبلی اور اکبر کے خط ضرور ایسے ہیں جو اگر منظر عام پر نہ آئے ہوتے تو ہمیں ان دونوں کی فطرت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکتا۔ شبلی کے خط حالی کے خطوں سے زیادہ دلچسپ ہیں۔ شبلی ایک تو عالم اور ادیب کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، اُن کے خط اُن کی علمی زندگی کے آئینے ہیں، دوسرے پرائیویٹ زندگی میں اُن پر دو تعلیم یافتہ خواتین کا جو اثر ہوا ہے۔ وہ بھی اُن خطوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ بعض حلقوں میں ان خطوں کی بنا پر شبلی کے عشق کی داستانیں لکھی گئی ہیں، بعض حلقے ان خطوں کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے، حالانکہ اگر شبلی کی نظمیں دیکھی جائیں تو خطوں میں جس اُنس و تعلق خاطر کا اظہار ہے اُس کا راز سمجھ میں آجائے گا۔ شبلی بڑے جذباتی آدمی تھے، وہ شاعر اور نکتہ سنج تھے، وہ خاصے جدت پسند تھے اور اپنے حلقے سے بہت آگے دیکھتے تھے، وہ ڈاکٹر انصاری کے قدموں کا بوسہ لینے کو تیار تھے، محض اس لئے کہ وہ ترکی کی خدمت کے لئے جا رہے تھے، پھر اُنھوں نے اگر بعض تعلیم یافتہ خواتین کی ہمت افزائی کی

تو اُس سے خواہ مخواہ غلط نتیجے نہ نکالنے چاہئیں۔ مکاتیب شبلی میں شبلی صرف ایک عالم دین اور ادیب کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، خطوط شبلی میں اُن کے اصلی خیالات ملتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پبلک زندگی کی مجبوریوں اور مصلحتوں کی وجہ سے اپنے اصلی خیالات ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ اِس سے شبلی کو منافق سمجھ نے کے بجائے زندگی اور اُس کی دشواریوں کا اندازہ کرنا چاہئے۔ شبلی کے خطوں سے میری نظر میں اُن کی عزت بہت زیادہ ہو گئی اور اکبر کچھ گر گئے۔ حیرت ہے کہ اکبر جیسا شاعر جو اشعار میں ایسی شوخ اور چنچل شخصیت رکھتا ہے، خطوں میں کیوں اِسقدر، کمزور، مصلحت بیں، جزرس اور چڑچڑا نظر آتا ہے۔ یہ نہیں کہ یہ خط اکبر کے نہ ہوں۔ ان میں جابجا جو جھلکیاں ہیں، آلام و افکار کے بادلوں میں جو شعر فتنی بجلیاں ہیں، وہ اکبر کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتیں، مگر ملازمت نے اکبر کو اتنا ڈرپوک بنا دیا تھا کہ وہ اِدھر وار کرتے تھے اُدھر معافی مانگتے تھے، وار کرنا فطرت کی طرف سے تھا اور معافی مانگنا اُنہوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ یہ نہیں کہ اکبر باغ و بہار آدمی نہ ہوں، وہ تو ہر وقت ہنسنے ہنسانے والے آدمی تھے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہنسنا ہنسانا اُن کی عادت ہو گیا تھا، یہ ایک اوپری قالب تھا جس کے اندر ایک سوکھی سہمی طبیعت چھپی ہوئی تھی۔ کچھ یہ بھی ہے کہ اکبر کے جو خط چھپے ہیں، وہ سب اُن کے بڑھاپے کے ہیں، یہ جوانی کے نشے کا خمار ہے۔

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ کل کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، بعض ہوٹل کے بیرون کا تبسم ایک نیکانیکی انداز رکھتا ہے، آپ انہیں انعام دیجئے اور وہ مسکرا کر آپ کا شکریہ ادا کر دینگے، اُن کا تبسم آپ کے انعام کی قیمت ہے جو انعام کی تعداد پر منحصر ہے۔ اسی طرح بعض ادبی شخصیتیں ہیں۔ خطوں میں اُن کے مذاق خاص کی خوب غمازی ہوتی ہے۔ مہدی افادی اور نیاز فتح پوری اس ذیل میں آتے ہیں، نیاز کا شعر پڑھنا اور مہدی کا عورت کا حوالہ قریب قریب ہیکانیکی ہیں۔ عورت اور شعر دونوں بڑی دلچسپ چیزیں ہیں جو ان پر ایمان نہ لائے وہ کافر، لیکن زیادتی ہر چیز کی بُری ہوتی ہے۔ نیاز کے خطوں میں ایک دلکش اور وسیع ادبیت ہے، اُن میں طنز بھی ہے اور ظرافت بھی، چھیڑ چھاڑ بھی اور تیز نشتر بھی، وہ ایک خاص ادبی شعور کے آئینہ دار ہیں جو بقول مہدی افادی کے دوم درجے کا ہرگز نہیں کہا جا سکتا، مگر اِن خطوں میں کہیں ان کا اسلوب نہیں بدلتا۔ کہیں وہ شعر پڑھنا ترک نہیں کرتے، کہیں خاص خاص تلمیحوں سے کام لینا نہیں چھوڑتے، یہ چیز اُن کا مزاج بن گئی ہے، مگر نہ معلوم کیوں اِس میں کوئی ارتقا نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں ہلکے اور گہرے رنگ نہیں ملتے۔ ان میں زندگی سے زیادہ کتاب ہے۔ بقول ترحیف کے یہ وہ ادب ہے جس سے

کمی اور ادب کی بو آتی ہے۔ نیاز کے خطوں میں خط سے زیادہ مضمون کا اسلوب ہے، نیاز افسانوں میں بھی دراصل انشا پرداز تھے اور خطوں میں بھی وہ انشا پردازی ہی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ یہ ان کا مزاج سہی۔ مگر ان سے خطوں کی نوعیت دوسری ہو جاتی ہے۔

مہدی کے خط بھی بڑے دلچسپ ہیں۔ خصوصاً اُن کی رنگین اور جالیاتی شخصیت کی وجہ سے، مگر نیاز کی طرح یہاں بھی ایک تکلف ہے۔ یہ تکلف اُن کی فطرت بن گیا ہے۔ ایک فرانسیسی ادیب کے متعلق کسی نے کہا تھا کہ اُس کے کردار آپس میں گفتگو نہیں کرتے، بلکہ ایک فقرہ دوسرے فقرے سے باتیں کرتا ہے۔ یہی بات نیاز اور مہدی افادی کے یہاں ہے۔ ان کی ادبیت، انہیں خطوں سے نکال کر مضمونوں کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ یہ وہ خط ہیں جو اشاعت کے خیال سے لکھے گئے ہیں یا رسالوں میں شائع کئے گئے ہیں، انہیں پڑھ کر وہ تصویریں یاد آتی ہیں جن میں مصنف کے چہرے پر ایک خاص رنگ اور اُس کے ہاتھوں میں ایک خاص کتاب ضرور دکھائی جاتی ہیں۔ میں اُن خطوں کی بعض دوسری خوبیوں کا بڑا قایل ہوں اور انہیں اب بھی لطف سے پڑھتا ہوں، مگر ان میں خطوں کا اصلی جذبہ نسبتاً کم ہے۔

اِس کے مقابلے میں محمد علی کے خط ہیں جن میں خطوں کی ساری خوبیاں ملتی ہیں۔ اگرچہ ان میں ادبیت اتنی زیادہ نہیں۔ محمد علی ان سیمابی ادیبوں میں سے تھے جو کبھی نچلے نہیں بیٹھ سکتے اور کبھی ایک چیز پر قانع نہیں ہو سکتے۔ سیاست ہو یا مذہب، ادب ہو یا تعلیم، وہ ہر مسئلے پر رائے دینے کو تیار تھے اور مسئلے سے یکساں دلچسپی رکھتے تھے، اُن کی شخصیت بڑی جامع رنگارنگ اور دلآویز تھی۔ وہ بہت بزرگ آدمی نہ تھے۔ ان کا جتنا احترام کیا جاتا ہے وہ زیادہ تر محض خوش فہمی اور عقیدت کی بنا پر ہے، وہ بڑے خود پسند، بڑے متلون مزاج، بڑے ضدی اور بڑے انتہا پسند آدمی تھے۔ وہ بس کرنا نہیں جانتے تھے۔ وہ اصول بڑے سخت بناتے تھے، مگر بعض اوقات خود بھی اُن پر عمل نہ کر پاتے تھے۔ مگر اُن کے خط بڑے زندہ، بڑے جیتے جاگتے، ہلکے پھلکے اور شگفتہ ہیں۔ اُن میں عالم و عامی سب کے لئے سامان موجود ہے۔ محمد علی کے یہاں بناوٹ نہیں ہے، ذہانت، شوخی، برجستگی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے مظاہرے سے آپ خوش ہونے کا جذبہ ہے۔ یہ وہ فن کار ہے جو اپنی تخلیق میں مست ہے۔

اِس کے ساتھ اقبال کے خط ہیں، جن سے دونوں کی طبیعتوں کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ اقبال زندگی میں تو اکثر بہکے ہیں مگر خطوں میں اپنے آپ کو لئے دیئے رہتے ہیں۔ محمد علی ہر جگہ ایک ہی ہیں۔ وہ جب آتے ہیں تو ایک شور کے ساتھ۔

اُن کے مضامین کی طرح خطوں میں ایک قسم کی خطابت ہے۔ محمد علی کے یہاں جذبے کی گرمی ہے۔ اقبال کے خطوں میں ذہن کی روشنی۔ اقبال کے خطوں سے اُن کی نظموں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اُن کے علمی و ادبی مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے سیکھنے اور جاننے کی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے۔ اُن کی ہر شخص سے اُس کی قابلیت کے مطابق گفتگو کرنے کی عادت معلوم ہوتی ہے، گویا ایک دریا ہے جو اپنے باوقار انداز سے برابر بہتا چلا جاتا ہے۔ ان خطوں میں ظرافت اور شوخی کم ہے حالانکہ اقبال بڑے زندہ دل آدمی تھے، ان سے اُن کی زندگی کے واقعات کا زیادہ علم نہیں ہوتا، اقبال محمد علی کیطرح اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتے، ہاں ان کی شاعری میں اُن کی شخصیت پوری طرح جھلکتی ہے۔ اقبال کے سارے خط اگر شایع ہو جائیں تو وہ اُن کی شاعری کی شرح بن سکیں گے، اس سے زیادہ نہیں۔ محمد علی کے خطوں سے اُن کی شخصیت کے قریب قریب تمام عناصر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس سے اقبال اور محمد علی کا موازنہ مقصود نہیں دونوں کے خطوں کی خصوصیات کا موازنہ مقصود ہے۔

انسانی فطرت بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔ اس پر کوئی لیبل لگانا بہت مشکل کام ہے۔ پریم چند نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انسانی فطرت نہ سفید ہوتی ہے نہ سیاہ، بلکہ دونوں رنگوں کا ایک مجموعہ، حالات موافق ہوئے تو انسان فرشتہ بن جاتا ہے ورنہ "شیطان" بات اتنی آسان بھی نہیں۔ وہی شخص ایک کے ساتھ فرشتہ ہے اور دوسرے کے ساتھ شیطان، اور بعض اوقات ایک شخص اپنے آپ کو فرشتہ سمجھتا ہے حالانکہ اسمیں شیطنت کے جراثیم موجود ہوتے ہیں۔ ادب کی دوسری شاخوں میں شخصیت ایک نہ ایک نقاب، سہارا، نشہ، جذبے کا سیلاب یا نصب العین کا سنہرا رنگ لئے ہوئے ہوتی ہے، خطوں میں جہاں بے تکلف دوستوں سے باتیں کرنی ہوتی ہیں، یہ نقاب خود بخود اُتر جاتا ہے۔ کچھ لوگ بے خیالی میں بھی نقاب ڈالے رہتے ہیں۔ اپنی بیوی سے بھی ایک لیڈر کی شان سے گفتگو کرتے ہیں یا شعر پڑھکر جان دینا چاہتے ہیں، جیسے کچھ لوگ سوتے میں بھی عینک لگائے رہتے ہیں۔ مگر خط کی خوبی یہ ہے کہ یہ نقاب اُتر ہی جاتا ہے۔ پھر جو شخصیت سامنے آتی ہے، وہ ساری شخصیت نہیں، مکمل نہیں، مگر اس کا ایک اہم اور ناقابل فراموش حصہ ہے۔ اس دنیا کے معیار، دوسری دنیاؤں سے مختلف ہوتے ہیں۔ بعض شاعر جس طرح نثر میں دو سطریں نہیں لکھ سکتے، یا بعض فن کار جس طرح گفتگو میں بالکل بدھو معلوم ہوتے ہیں، اسی طرح خطوں کی دنیا میں بھی شہرتیں بنتی اور بگڑتی ہیں، داغ کی شاعری دیکھئے اور اُن کے خط پڑھئے، کوئی نسبت نہیں ہے، مولانا احسن

کی شاعری پھیکی اور بے کیف ہوتی تھی اُن کے خط بڑے مزے دار ہوتے تھے، فلک پیما سے لوگ زیادہ واقف نہیں مگر اُن کے خط اُن کے مضامین سے بھی زیادہ جاندار ہیں، رشید صدیقی کا آرٹ سب سے زیادہ شباب پر اُن کے بے تکلف خطوں میں نظر آتا ہے، مولانا عبدالماجد کے مضامین میں جو جذباتیت ہے وہ خطوں میں غائب ہو جاتی ہے، غرض کہ یہ دُنیا بھی بڑی دلچسپ پُر اسرار اور رنگا رنگ ہے گو اِس میں وقتی جذبات اور فوری کیفیات کی مصوری زیادہ ہے۔ کردار اور شخصیت کو سمجھنے کے لئے خطوں کا مطالعہ بہت مفید ہے مگر صرف خطوں پر بھروسہ کرنا، اِسی طرح خطرناک ہے جس طرح صرف گفتگو پر۔ دونوں میں زندگی ہے مگر استواری لازمی نہیں۔

اُل اَحمد سرور

علامہ
سر محمد اقبال میری نظر میں

مجھے کالج چھوڑے آج تیس برس سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے ۔ گو ایسا اتفاق کبھی کبھار ہوتا ہے لیکن جب بھی مجھے کسی ایسے مجمع میں شمولیت کا موقعہ ملتا ہے جیسا آج ہے تو شاید گرد و نواح کی فضا جس کو انگریزی میں Atmosphere کہتے ہیں ۔ اس کے اثر سے میرے جسم میں خون ایک نئی طرح سے حرکت کرنے لگتا ہے اور میں اپنے دماغ میں اس قسم کے محسوسات گردش کرتے ہوئے پاتا ہوں ۔ جو کبھی ہوا کرتے تھے ۔ جب آتش جوان تھا ۔

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ کے سامنے علامہ اقبال مرحوم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں ۔ علامہ موصوف کے متعلق بہت بڑے بڑے قابل اصحاب اور اُن کے برسوں کے ۔ بے تکلف دوست اظہار کر چکے ہیں اور درجنوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں ۔ اُن کے مقابلہ میں مجھ بیچارے کی کیا حقیقت ہے کہ آپ کو کوئی ایسی بات بتا سکوں جو آپ نے پہلے سُنی یا پڑھی نہ ہو ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اِس لئے انتخاب کیا گیا ہے کہ علامہ مرحوم کے دوست احباب ۔

اُن کے شعر و سخن کے قدر دان - ان کے مذہبی فلسفہ - اسرار ہائے خودی - اور رموز ہائے بیخودی کے جاننے والے تو بہت کچھ لکھ چکے - لیکن اُن کے کسی شاگرد نے آج تک بحیثیت شاگرد کے اپنے محسوسات بیان نہیں کئے اور مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے مہینوں مسلسل اُن کے قدموں میں بیٹھ کر اُن سے انگریزی کی وہ نظمیں پڑھیں جو اس زبان میں اپنی قسم کی بہترین خیال کی جاتی ہیں - اور اس میں وہ لطف حاصل کیا جو مشرق کے سب سے بڑے شاعر کی زبان سے مغرب کے سب سے بڑے شعرا کا کلام پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے -

اقبال کی یاد میں غالباً ان موقعوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جب پہلے پہلے میں نے انہیں دیکھا - میاں شاہ نواز بیرسٹر ایٹ لا مرحوم سے ان کے ہمیشہ خاص تعلقات رہے - ان دونوں کی آپس میں بے انتہا بے تکلفی تھی - اور آخر تک بھی یہ دونوں جب ملتے گفتگو کا رنگ وہی پرانا شروع ہو جاتا - میرے چچا میاں سر محمد شفیع مرحوم اور میاں شاہ نواز اُن دنوں لاہور ہائیکورٹ کے پہلو میں ایک ہی احاطے کی دو کوٹھیوں میں رہتے تھے - غالباً ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب میری عمر بھی تیرہ چودہ برس کی تھی چچا سر شفیع کے یہاں میرا آنا جانا اکثر ہوتا تھا کیونکہ وہاں میرے ایک دو ہم عمر رفیق بھی رہتے تھے - مجھے خواب کی طرح لیکن صاف یاد ہے کہ جس کمرے میں ہم لڑکے بیٹھا کرتے تھے اس کے برابر والے کمرے میں ان زندہ دل جوانوں کی بے تکلفانہ محفل جما کرتی تھی - ہمیں اس شمولیت کی اجازت تو ہو ہی نہ سکتی تھی لیکن ہم دروازے کے روزنوں میں سے اور کسی کھلے دروازے کے باہر دیوار سے لگ کر اُن کی باتیں سنا کرتے تھے اور جہاں اندر سے کسی بزرگ کے باہر نکلنے کی آہٹ ہوتی بھاگ کر چھپ جایا کرتے - اقبال ان دنوں اس کے محفل کے روح رواں تھے - اور ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ حد درجہ کے رند مشرب ہیں - اُن کی آواز سب سے زیادہ بلند ہوتی اور باتوں میں کھلا مذاق جس کے لئے پنجابی زبان خاص طور پر موزوں ہے -

اُسی زمانہ میں انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسے انجمن کی پرانی شیرانوالہ دروازہ والی عمارت میں ہوا کرتے تھے - اور چونکہ ان جلسوں میں اکثر اوقات دلچسپی کا کافی سامان ہوا کرتا - ہم بھی کئی کئی دن کا پروگرام ہونے کے باوجود جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا شمولیت سے ناغہ نہیں کرتے تھے - خصوصاً اُن دنوں میں جب اُسوقت کے نوجوان شعرباز - جن میں سے خان احمد حسین خاں اور اقبال خاص طور پر ممتاز تھے - اپنا کلام سنانے والے ہوں - مجھے یاد ہے کہ اقبال ایک خوش وضع جوان کی صورت - ہلکی پھلکی سی عینک لگائے - گلے کا بٹن کھلا ہوا - شلوار پہنے اسٹیج پر آیا کرتے تھے - اور اُن کے

آتے ہی وہ ہنگامہ جو چیدہ جمع کرنے اور خشک و بے لذت تقریر کرنے والوں کی وجہ سے تمام ہال میں برپا رہا کرتا تھا۔ تالیوں کی ایک شامہ توڑ بوچھار کے بعد یک لخت بند ہو جاتا۔ اور وہ نغمے فضا میں گونجنے لگتے جن کے سننے کی آرزو میں ہم جم غفیر کی بھیڑ بھاڑ میں دھکے کھاتے ہوئے داخل ہو کر صبح سے چاروں طرف کے دباؤ کے جھونکے برداشت کئے ہوئے بیٹھے تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ہماری سمجھ میں کچھ آتا تھا یا نہیں آتا تھا کہ شاعران نکتہ سنج کیا کہہ رہے ہیں، بہرحال اقبال کے دلکش ترنم میں وہ مزا آجاتا تھا جو شاید کسی محفلِ رقص و سرود میں بھی نہ آتا۔ اور ان کے اشعار کی داد اس بے تکلف دل سے نکلے ہوئے جوش کے ساتھ دیجاتی جو پنجاب والوں ہی کا حصہ ہے۔ ان جلسوں میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کے بڑے بڑے آدمی شرکت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ مولوی نذیر احمد، شبلی نعمانی اور حالی جیسی ہستیوں کو پہلے پہلے میں نے وہیں دیکھا یا سنا۔ مولانا حالی بہت ضعیف تھے اور آواز اتنی نہ تھی کہ تمام حاضرین سن سکتے۔ لاؤڈ سپیکر کا زمانہ نہ تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے ایک دفعہ مولانا حالی اپنی نظم کے ایک دو اشعار پڑھ کر بیٹھ گئے اور مسودہ اقبال کو دیدیا جو انھوں نے اپنی مخصوص طرز میں سنایا۔ اور نظم پڑھنے سے قبل ایک فی البدیہہ رباعی کہی جس کے قافیہ ردیف نام حالی کلام حالی وغیرہ تھے۔ الفاظ مجھے یاد نہیں۔

اس کے بعد اقبال ولایت چلے گئے۔ اور ہم تعلیم کے جھمیلوں میں پھنس گئے۔ اور کئی سال تک سوائے اسکے کہ اقبال کی کوئی نئی غزل مخزن میں نکلی اور ہم نے جھٹ اپنی بیاض میں نقل کر کے اسے یاد کرنا اور گانا شروع کر دیا۔ ان کا سامنا نہ ہو سکا۔ ولایت سے واپس آنے کے بعد ان کے تغزل کے رنگ میں بھی فرق آنے لگا۔ اور اس میں کم از کم اس وقت ہمارے لئے وہ رندانہ بات نہ رہی جو ان کی ولایت سے بھیجی ہوئی اس مشہور غزل کے مقطع میں ہے۔ ؎

نہ پوچھو اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سرِ رہ گذار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہو گا

جملہ معترضہ ہوا جاتا ہے لیکن اس غزل کا ذکر آجانے کے بعد میں اس کے بعض دیگر اشعار پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا خصوصاً اس لئے کہ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے خیالات میں وہ پختگی اور بیدار مغزی جو بعد میں ان کی چار دانگ عالم میں شہرت کا باعث بنی۔ اس وقت ہی جب وہ ولایت میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ پیدا ہو چکی تھی۔ اور یہ شعر کے ذریعہ سے خدا کا پیغامبر ابھی سے "دانائے راز" بننے کی طرف قدم اٹھا چکا تھا۔

مطلع میں وہی جوانی کی جھلک ہے جو مقطع میں پائی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا ؛ سکوت تھا پردہ دار جسکا وہ راز اب آشکار ہوگا

دوسرا شعر ہے دیکھئے کسطرح رنگ بدلتا ہے۔

جو پہلے آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے ؛ برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خارزار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا ؛ سنا ہے یہ قدسیوں سے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

یہ اسلام کے مستقبل کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن آگے دیکھئے ارشاد ہوتا ہے۔

دیارِ یورپ کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے ؛ جسے کھرا تم سمجھ رہے ہو وہی زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی ؛ جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا۔ ناپائدار ہوگا

ہمارے نوجوانوں کو ولایت کی چند دن ہوا لگ جاتی ہے تو صاحب بہادر بن جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک ہندوستانی نوجوان تھا جو ولایت سے لکھ رہا ہے۔ اور ملاحظہ کیجئے کہ اسکی پیشین گوئی چالیس برس جیسی قلیل مدت میں کہانتک سچ دکھائی دے رہی ہے۔ یورپ والوں کی تہذیب موجودہ جنگ عظیم اور "اٹامک بمب" کی شکل میں اپنی خودکشی کے سامان فراہم ہو جانے کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔ اور شاخِ نازک پہ آشیانہ جو انھوں نے بنایا ہے یعنی روپیہ اور سرمایہ داری پر اس تہذیب کی بنا رکھی ہے۔ یہ کسقدر نازک ہے۔ اور خدا کی بستی یعنی موجودہ نظامِ دنیا کو صرف روپیہ کے زور سے چلانے والے کہانتک اور کب تک کامیابی کی امید رکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد پھر دوبارہ اسلام کیطرف رجوع ہوتا ہے۔ اور ارشاد کیا ہے۔ ؎

سفینۂ برگِ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا ؛ ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

یعنی ہم مسلمان خواہ کتنے بھی کمزور بے دست و پا معلوم ہوتے ہیں۔ ان کمزور چیونٹیوں کی طرح جو گلاب کی پتی کی کشتی بنا کر دریا کے پار ہو جاتی ہیں آخر کار اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ یہ ہے درسِ امید۔ یہ ہے اپنی گذشتہ شان و شوکت کو یاد کر کے رونے دھونے کی بجائے اسلام کے آخر میں فتح پانے کا یقین دلا کر اپنی پوری جدوجہد جاری رکھنے کی ترغیب۔ اور یہی اقبال کا وہ پیغام ہے جو اس نے دنیائے اسلام کو دیا ہے۔

اقبال کے ولایت سے واپس آجانے کے بعد غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں جب میں سکول

سے کالج میں پہنچ چکا تھا۔ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہوا۔ جلسے سے پہلے یہ خبر اڑ گئی تھی کہ اقبال اپنی کوئی خاص نئی نظم پڑھنے والے ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ وقت سے دو گھنٹے پہلے کالج سے بھاگ لئے اور ابھی چونکہ پنڈال اچھی طرح بھرا نہ تھا۔ عین ڈائس کے کنارے جس کے اوپر بڑے لوگوں کے لئے کرسیاں بچھی تھیں۔ پاؤں نیچے لٹکا کر جم گئے۔ کالج کے چار پانچ نوجوان اگر تہیہ کر کے کہیں بیٹھ جائیں تو انہیں کوئی رعب یا دھمکی دیکر اٹھا تو لے۔ خصوصاً ایسے جلسے میں جس میں اقبال نئی نظم پڑھنے والے ہوں۔ دو چار قانون اور حفظ امن کے چوکیدار آئے اور ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ لیکن یہاں نو زمین جنبد نہ جنبد والا تہیہ کر کے بیٹھے۔ کسی سے مذاق کسی سے پھبتیاں۔ کسی سے کامل خاموشی بلا حرکت کی سیاسی پالیسی برتی گئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ جب وقت کم رہ گیا اور جگہ کی قلت پیدا ہوئی تو ایک ہی ہلے میں ڈائس کے چاروں طرف کے کنارے پاؤں لٹکائے ہوئے والے نوجوانوں سے بھر گئے۔ اور کسی سینے پر کپڑے کا پھول لگا کر اکڑنے والے کی دال نہ گلی۔

غرضکہ اقبال ڈائس پر آئے۔ چاروں طرف سے اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ بلند ہوا۔ اور حسب معمول ڈائس پر تھوڑی بہت گھسر پھسر کے بعد وہ اپنی نظم پڑھنے کو کھڑے ہوئے۔ باوجود سامعین کے بیحد اصرار کے اقبال نے نظم کو ترنم سے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ ترنم سے پڑھنا نظم کے مضمون سے مناسبت نہیں رکھتا۔ معلوم ہوا کہ نظم کا عنوان "شکوہ" ہے اقبال پہلا بند پڑھنے لگے۔

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن۔ ہے مجھ کو

ہزاروں کے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ کیا مجال کہ کسی کے سانس لینے کی آواز تک سنائی دیجائے۔

دوسرا بند شروع ہوا۔

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

ساز خاموش ہیں۔ فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو مجبور ہیں ہم

اے خدا۔ شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے

خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

نظم لمبی ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ صاحبان میں سے جن کو اس کے پڑھنے یا سننے کا موقع نہیں ملا وہ کم از کم یہ اندازہ کر سکیں کہ کس پایہ کی چیز ہے اور آئندہ فرصت کے وقت اسے پڑھ کر سعادت حاصل کریں۔ اس لئے دو تین بند اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہر بند میں شکوہ کا جوش بڑھتا چلا جاتا ہے۔

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں   خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں   کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی

کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں   عجز والے بھی ہیں مستِ مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں   سیکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

یہ شکایت نہیں ہیں ان کے خزانے معمور   نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور   اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں۔ ہم پہ عنایات نہیں

بات کیا ہے کہ وہ پہلی سی مدارات نہیں

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے   شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے   آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

غرض کہ جوں جوں اِقبالؔ نظم پڑھتے جاتے تھے۔ سامعین کا جوش بڑھتا جاتا تھا اور ہر بند کے بعد تالیوں اور نعروں کا ایک طوفان برپا ہو جاتا تھا۔ جس کے خاموش ہونے تک اِقبالؔ کو بار بار رک جانا پڑتا۔ اسی ہنگامہ پرور شان کے ساتھ یہ نظم شروع سے آخر تک پڑھی گئی۔ اور نئے اِسلامیہ کالج لاہور کے میدان میں آجتک انجمن حمایت اسلام کے یا دوسرے جتنے بھی جلسے ہوئے اُن میں مجھے یاد نہیں کہ کسی میں اسقدر جوش و خروش کا اظہار کیا گیا ہو جسقدر کہ اِس قابل یادگار موقع پر ہوا۔

شکوہ کے شائع ہونے کے بعد چاروں طرف سے جوابوں کی بوچھار شروع ہوئی۔ کھلے خطوط میں اخباری مضامین میں۔ نثر میں۔ نظم میں۔ درجنوں پمفلٹ شائع ہوئے۔ لمبی داڑھی والے مولویوں نے اِقبالؔ کو بہت کچھ برا بھلا کہا۔ لیکن اِقبالؔ بالکل خاموش رہے۔ اِس کے کچھ عرصہ بعد اِن کی نظم شمع و شاعر نکلی۔ لیکن یہ قدرے مشکل زبان میں لکھی گئی ہے اور مقصد اور خیالات زیادہ تر سیاسی ہیں۔ سوائے اعلیٰ تعلیم یافتہ اِسلامی پبلک کے اِس کا لطف کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ اِس لئے گو اسکی شہرت بہت ہوئی لیکن عام نہیں۔

اِس سے بھی چند ماہ یا شاید سال بعد۔ جنگ بلقان کے دوران میں خبر ملی کہ اقبالؔ نے خود شکوہ کا جواب لکھا ہے۔ جو عنقریب کسی جلسہ میں پڑھا جائے گا۔ اِس پر جوشِ اُمید ہر طرف پھیل گیا۔ اور شاید اِسی سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مولوی ظفر علی خاں زمیندار والوں نے لاہور موچی دروازہ کے باہر باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ کا اہتمام کیا اور مشتہر ہوا کہ اِس میں اِقبالؔ کی نظم ہوگی۔ شایقین کا ایک جم غفیر باغ کے پنڈال میں جمع ہوا۔ میں خود اس جلسہ میں بھی موجود تھا۔ اِقبالؔ نے نظم اُسی طرح ہر طرف سے داد کی بوچھاڑ میں پڑھی۔ ایک ایک شعر نیلام کیا گیا۔ اور ایک گراں قدر رقم بلقان فنڈ کے لئے جمع ہو گئی۔

یہ نظم کئی لحاظ سے شکوہ کی نسبت بہت زیادہ بلند ہے اور اِس میں پہلے مسلمانوں کو یہ بتا کر کہ اِن کا شعار اِسلامی نہیں رہا۔ وہی سبق دیا گیا ہے جو اقبالؔ کی طرف سے اہلِ اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

یعنی یہ کہ زمانہ گذشتہ کی یاد میں رونے دھونے سے کچھ حاصل نہیں۔ اسلام فنا نہیں ہو سکتا۔ اگر کوشش کرو تو سب کچھ ممکن ہے اور اللہ تعالیٰ کوشش کرنے والوں ہی کے ساتھ ہے۔ چند بند سن لیجئے۔ تاکہ اِقبالؔ کے دردِ قومی کے

خلوص کا اندازہ ہو سکے - اللہ سے شکوہ کے بعد دیکھئے جواب کس طرح شروع ہوتا ہے -

دِل سے جو بات نِکلتی ہے اثر رکھتی ہے پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رِفعت پہ نظر رکھتی ہے خاک سے اُٹھتی ہے گردوں پہ گذر رکھتی ہے

عِشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بیباک مرا

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا اشک بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا کسقدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا

شکر شکوہ کو کیا حُسنِ ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے - جوہرِ قابل ہی نہیں جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈ نے والوں کو دُنیا بھی نئی دیتے ہیں

کیا کہا؟ بہرِ مُسلماں ہے فقط وعدۂ حور شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

شور ہے ہو گئے دُنیا سے مسلماں نابود ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود یہ مسلماں ہیں؟ جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یوں تو سیّد بھی ہو - مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو - بتاؤ تو مسلمان بھی ہو - ؟

یہاں تک تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِقبال کے شکوہ کا جواب تھا۔ اَب پیغام سُنئے:۔

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی ؛ کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی ؛ گل برانداز ہے خونِ شہدا کی لالی

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو۔ عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی اُفق تابی ہے

مثلِ بُو قید ہے غنچہ میں پریشاں ہو جا ؛ رخت بردوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ۔ تو ذرّے سے بیاباں ہو جا ؛ نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

انجمن کے جلسوں میں بعض اَوقات حاضرین اَور منتظمین کے درمیان بڑی دلچسپ نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ منتظمین میں عام طور پر اُردو کے اُن دنوں غالباً سب سے زیادہ مقبول اَخبار "پیسہ اخبار" کے ایڈیٹر مولوی محبوب عالم صاحب اَور اُن کے چھوٹے بھائی عبدالعزیز پیش پیش ہوا کرتے تھے۔ لڑکے خوش طبعی سے اُنہیں پیسہ اور دھیلا کہا کرتے تھے۔ گو اِس سے کسی قسم کی تحقیر مقصود نہ تھی۔ لیکن عبدالعزیز صاحب خصوصاً چونکہ انجمن کے جلسوں میں چندہ جمع کرنے کیلئے سب سے زیادہ پروپیگنڈا کیا کرتے تھے اِس معاملے میں اُن کے اَور حاضرین کے درمیان خصوصیت تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ جہاں کسی پسندیدہ شاعر کی نظم یا اَچھے مقرر کی تقریر کا وقت آیا۔ عبدالعزیز صاحب ڈائس پر کھڑے ہو گئے اَور کہنے لگے کہ آپ فلاں صاحب کی نظم سُننے کے لئے بیچین ہیں۔ وہ موجود ہیں اَور سُنانے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن چندہ کی رقم مثلاً ساڑھے چار ہزار روپے تک پہنچ چکی ہے۔ پانچسو اَور دلوائیے تو نظم شروع ہو گی۔ ورنہ جب تک پانچ ہزار پورے نہ ہو نا گے آپ کو اِنتظار کرنا پڑے گا۔ اِس پر لوگ جلدی جلدی دوڑتے اَور رقم پوری کر دیجاتی تو نظم شروع ہوتی۔ اِس کا جواب حاضرین کو موقع مل جاتا تھا تو اِسطرح دیا جاتا تھا۔ کہ ڈاکٹر اقبال کی اگر جلسے میں کوئی نظم نہیں ہوئی اور وہ حاضرین میں موجود ہیں۔ تو ایک صاحب کھڑے ہو گئے اَور بلند آواز سے کہا کہ آج تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے ہیں۔ آپ نے ہماری دلچسپی کا کوئی سامان مہیا نہیں کیا۔ لہذا علامہ اقبال سے اُن کے چند غیر مطبوعہ اشعار سُنوا دیجئے۔ اَور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو چندہ کبھی

نہیں ہو گا - تمام حاضرین تہیہ کر کے بیٹھ جاتے کوئی ایک پیسہ نہیں دیتا - چنانچہ منتظمین مجبور ہو جاتے اور علامہ کی منت سماجت کر کے اشعار پڑھواتے - ایک ایسا موقع مجھے یاد ہے کہ اقبال مسکرا کر اٹھے اور ایک فی البدیہہ رباعی مزاحیہ شان میں پڑھی - ٹھیک الفاظ مجھے یاد نہیں - کچھ اسطرح تھے - پلندہ باقی - بہت ہے چندہ باقی - اور ابھی تو رہتا ہے بندہ باقی - وغیرہ - اور یہ سنا کر بیٹھ گئے -

حاضرین نے پہلے تو خوب تالیاں بجا کر داد دی - اس کے بعد ایک صاحب اٹھے اور کہنے لگے کہ اس رباعی کا بہت بہت شکریہ - لیکن شوق پورا نہیں ہوا - حسرت رہی جاتی ہے - چنانچہ علامہ پھر اٹھے اور چند اشعار سنا کر چندے کی گاڑی کو دوبارہ چلتا کر دیا -

ٹھیک تاریخیں یاد نہیں لیکن ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء کا ذکر ہے جب میں لاہور گورنمنٹ کالج میں بی اے میں پڑھتا تھا اقبال کئی مرتبہ اس کالج میں پڑھانے پر مامور ہوئے لیکن ہمیشہ فلسفہ کی تعلیم دیا کرتے تھے - اس مرتبہ شاید پرنسپل کی غیر موجودگی یا کسی اور وجہ سے ہماری جماعت کو انگریزی نظم کا سبق دینا ان کے فرائض میں شامل ہو گیا - اور ہماری بیحد خوش قسمتی تھی کہ ہم نے انگریزی زبان کے بہترین شعرا کی چند بہترین نظمیں ان سے پڑھیں - ان میں جہانتک مجھے یاد ہے ملٹن کی Isabella کیٹس کی Lycidas اور Il Penseroso, L'Allegro ڈرائڈن کی Mac Flecknoe اور غالباً گرے کی Gray's Elegy Ancient mariner شامل تھیں - علاوہ شیلے کی Adonais کے جس کا میں خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں - کیونکہ یہ بلا مبالغہ انگریزی زبان کی چند سب سے بلند نظموں میں سے ایک ہے - شیلے کا تخیل ہمارے مشرقی شعرا کی طرح گہرا اور پر معنی ہوتا ہے اور جس طرح ہمارے شعرا ایک ہی شعر میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اسیطرح شیلے کے ایک بند میں خیالات کا ہجوم ہوتا ہے جن کو علیحدہ علیحدہ کر کے پوری طرح سمجھنے کے لئے قدرے محنت درکار ہوتی ہے - اس خاص نظم (Adonais) کے متعلق میں ذرا تفصیل سے کام لینا چاہتا ہوں کیونکہ اس کے بغیر اوستاد کی اوستادی حیثیت کی حقیقت کا اظہار نہیں ہو سکے گا - آپ کے معلمین تو جانتے ہوں گے لیکن آپ میں سے شاید ہی کوئی طالب علم ایسا ہو جسے معلوم ہو کہ یہ نظم شیلے نے اپنے دلی دوست اور مشہور شاعر Keats کے مرثیہ کے طور پر لکھی تھی جس کا صرف چوبیس برس کی عمر میں - نقادوں کے نہایت بے رحمی سے اس کی بعض نظموں پر اعتراضات کرنے کے صدمہ سے

اِنتقال ہو گیا تھا یہ تمام نظم صحیح معنوں میں درد و غم کے اثرات سے معمور ہے اَور ہر مصرع میں ایک زخم خوردہ دل کے خون کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ عجیب بات ہے۔ نظم کے آخری تین چار بندوں میں اُس انتہائی مایوسی اَور شدت غم کے ذکر کے ساتھ جو کیٹس کی جُدائی سے شیلے پر چھا گیا تھا۔ شیلے کی اپنی موت کا جو اِس نظم کے لکھنے سے تین چار سال بعد واقع ہوئی۔ ہو بہو نظارہ موجود ہے۔ گویا یہ ایک قسم کی پیشگوئی تھی کہ میری موت اِسطرح واقع ہونیوالی ہے۔ گویا اوّل تو لکھنے والا شیلے۔ دوسرے اس کی وہ نظم جو انتہائی Emotion کی حالت میں لکھی گئی۔ اَور تیسرے پڑھانے والا ڈاکٹر اقبال جو خود گہرے تخیل کا بادشاہ ہے۔ اِس مجموعہ نے شاگردوں کی جماعت کے اُن افراد پر جو حساس دِل رکھتے تھے وہ اثر کیا کہ تمام عمر فراموش نہیں ہو سکتا۔

اِس نظم کے پچپن بند ہیں اَور ڈاکٹر صاحب پینتالیس منٹ کے ایک کالج کے گھنٹے میں نو، نو مصرع کا ایک بند ہی روزانہ پڑھاتے تھے۔ اِسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اِن کو پڑھانے میں اَور جماعت کو پڑھنے میں کتنا لطف حاصل ہوتا ہو گا۔ جب شیلے کے خیالات کو علامہ اقبال جیسا آدمی سمجھانے کی غرض سے واضح کرے اَور ہر خیال کے ساتھ مقابلہ یا موازنہ کے طور پر اَپنے اَور اُردو کے دیگر شعرا کے خیالات شامل کر دے۔ تو سامعین کی خوش قسمتی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ ایک دریا تھا جو بہتا چلا آتا تھا۔ علامہ کے مُنہ سے پھول جھڑتے تھے اَور دِل یہ ہی چاہتا تھا کہ وہ اِس طرح پڑھاتے جائیں اَور ہم دِن بھر خاموش بیٹھ کر سُنا کریں۔ کالج کا گھنٹہ جو عام طور پر طالب علم کے لئے محنت سے چھٹکارے کی مسرت انگیز خبر لئے ہوئے آیا کرتا ہے۔ اِس گھنٹے کے ختم ہونے سے دِل پر ایک چوٹ کی شکل میں لگتا تھا۔ اَور ہم بادلِ ناخواستہ اُٹھ کر کمرے سے باہر چلے جاتے تھے۔

میں چاہتا ہوں کہ اِسی شیلے کی Adonais سے مثال کے طور پر ایک چیز پیش کر دوں جس سے آپ کو مندرجہ بالا گھنٹوں کی کیفیت کا اندازہ ہو سکے۔ اِس کے دوسرے بند کی آخری سطر میں شیلے کہتا ہے کہ "اُن قبر پر اُگے ہوئے پھولوں کی طرح جو دفن شدہ اِنسان کی بے ثباتی اَور نفرت انگیز صورت پر ہنستے ہیں۔ کیٹس نے اپنی آنے والی ہولناک موت کو اَپنے آخری نغموں سے اِس طرح سجا کر چھپا رکھا تھا کہ وہ نظر نہیں آتی تھی"۔

کسی قبر پر اُگے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر شیلے کے دِل میں یہ خیالات پیدا ہوئے کہ ایک تو وہ پھول اِنسان کی بے ثباتی پر ہنستے ہیں۔ دوسرے وہ اِنسانی لاش کے ڈراؤنے پن کو اَپنے حُسن سے سجا کر چھپا دیتے

ہیں -

اِس کے مقابلہ میں مرزا غالبؔ فرماتے ہیں :-

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اِن ہی قبر کے پھولوں کو دیکھ کر غالب کے دِل میں یہ خیالات پیدا ہوئے کہ یہ پھول ان دل فریب صُورتوں کے حُسن کا ایک حصہ ہیں جو اِس خاک میں دفن ہیں - اَور جنہیں ان کے حُسن کی طاقت نمود نے مٹی کے باہر ظاہر کر دیا ہے -

علامہ اقبالؔ کا انگریزی تلفظ کچھ اچھا نہ تھا - شیلے کو شیلی کہتے تھے اَور اُردو فارسی بھی حد درجہ پنجابیت لئے ہوئے لہجہ میں بولتے تھے - یعنی قاف کو کاف ہی کہتے تھے اَور حقہ کو حُکّہ - اِسی بنا پر مولانا نیاز فتحپوری نے اَپنی مشہور "ڈائری" میں اِقبالؔ کی صورت شکل اَور طرزِ گفتگو کو نہایت غیر شاعرانہ بیان کیا ہے - لباس کی طرف کبھی توجہ نہیں کی - یہاں تک کہ کالج یا ہائی کورٹ میں انگریزی سوٹ پہن کر جاتے تھے تو وہ بھی ڈھیلا ڈھالا بغیر اِستری کے - ٹائی ٹیڑھی ہے تو ٹیڑھی ہی سہی عام طور پر بندھی بندھائی بوچکا لیا کرتے تھے - بوٹ میلے ہیں تو کچھ پَروا نہیں، بالوں کی مانگ نہیں نکالتے تھے پیچھے کو بُرش کر لیا کرتے تھے - پہلے ہمیشہ ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے - بعد میں بالدار سیاہ ٹوپی اختیار کر لی تھی، باوجود اِس کے - ہماری اُس سال کی گورنمنٹ کالج کی بی اے کی جماعت جو شروع سنٹرل ماڈل اسکول سے ہی اپنی شرارت پسندی کے لئے مشہور چلی آتی تھی اَور خصوصاً بُرے تلفظ والے پُروفیسر کا تو ناک میں دَم کر دیا کرتی تھی - اِن کے گھنٹے میں اسقدر خاموش ہو کر بیٹھ جاتی تھی کہ ایک تنکا بھی زمین پر گرے تو اسکی آواز سُنائی دیجائے - مجھے یاد نہیں کہ اِقبالؔ نے کبھی کسی لڑکے کو کسی قصور پر سزا دی ہو - بلکہ ڈھکی تک کبھی نہیں دی - حیرت کی بات ہے کہ مجھے اَب علم ہوا ہے کہ اُن کی داہنی آنکھ بیکار تھی - جماعت میں ہمیشہ اُن سے قریب ہی بیٹھا کرتا تھا لیکن میں نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ وہ صرف ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں - میں نے علامہ کو سگریٹ یا سگار پیتے کبھی نہیں دیکھا - گو سُنا ہے کہ حقّے کے بہت شوقین تھے - کالج میں تو بغل میں ایک آدھ کتاب یا کلاس کا رجسٹر لئے - سر جھکائے کبھی کچھ گنگناتے ہوئے اِدھر اُدھر جاتے دِکھائی دیتے تھے - کسی سے بات چیت نہ کرتے تھے - اِن دنوں ہمارے

کالج میں ایک سوسائٹی بزمِ سخن کے نام سے تھی - جس کے جلسے عام طور پر پندرھویں دن یا مہینے میں ایک بار ہوا کرتے تھے - ایک زندہ دل پروفیسر شیخ نورالٰہی صاحب اس کے مستقل صدر تھے - ہر جلسے میں اپنے کالج کے علاوہ دوسرے کالجوں کے اتنے طالب علم جمع ہو جایا کرتے جتنے کمرے میں سما سکتے - اس بزم میں کالج کے لڑکے اپنا منظوم کلام جو زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہوتا سنایا کرتے تھے - بعض اوقات" طرح "مقرر کر دی جاتی تھی جس پر سب مشقِ سخن کرتے تھے - اور چونکہ ہمارے صدر میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ زندہ دل تھے - وہ مبتذل قسم کی عریانی کے سوا ہر قسم کی بات کہہ لینے دیا کرتے تھے - آجکل کی طرح اوسوقت شعرا میں اتنی عریاں پسندی بھی نہ تھی - لیکن مذاق اور بھپتیوں میں کالج کے کسی نہ کسی رنگ میں ممتاز طالب علموں - اور پروفیسروں تک کو شعر میں باندھ لیا جاتا تھا جس سے جلسہ کی دلچسپی روز افزوں تھی - خدا جانے اب تک وہ بزم قایم ہے یا نہیں - بہرحال اسوقت بہت کوشش کی گئی لیکن صدر بننا تو درکنار - علامہ اقبال کبھی اس کے ایک جلسہ میں بھی شریک نہ ہوئے - البتہ College Day کے موقع پر ہر سال کسی بھلے آدمی نے بہترین اردو نظم کے لئے ایک مستقل انعام مقرر کر رکھا تھا - اس مقابلہ میں جو نظمیں لڑکے بھیجتے ان کے جج علامہ اقبال ہی ہوا کرتے - یہاں تک کہ جب وہ کالج میں پڑھاتے نہیں بھی تھے - تو یہ نظمیں فیصلہ کے لئے انہیں کے پاس بھیجی جایا کرتی تھیں - بعد میں وہ نظمیں جو اوّل دوم اور سوم درجہ پر رہتیں - کالج ڈے کے دن تمام لڑکوں کے سامنے ان کے مصنف پڑھ کر سناتے - اور انعام حاصل کرتے تھے ویسے عام طور پر بھی علامہ نوجوانوں کے شعر کہنے کے خلاف تھے - مجھے یاد ہے کہ ان کی پروفیسری کے دنوں میں جب وہ ہمیں پڑھاتے تھے - ہم ان کی کلاس کے دو تین لڑکے اپنی اپنی غزلیں لے کر ایک دن اکھٹے ان کے پاس گئے اور عرض کیا کہ ہم آپ کے شاگرد ہیں اور شعر کہنے کا شوق رکھتے ہیں - اگر کبھی کبھی آپ ہماری ناچیز کوشش دیکھ کر تھوڑی بہت اصلاح فرما دیا کریں تو بڑی عنایت ہوگی - فرمایا بھائی میں کبھی کسی کے اشعار پر اصلاح نہیں دیا کرتا - جو تمہارے دماغ میں آئے لکھو - لیکن اگر میری نصیحت مانو تو شعر کہنا چھوڑ دو - یہ مشغلہ اچھا نہیں -

اقبال کے ملنے والے عام طور پر کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں بہ فراغت بیٹھے ہوئے بھی جب کبھی بات چیت کے دوران میں کوئی اچھے اشعار پڑھے جاتے تو ان کے آنسو نکل آتے تھے - اور یہ تو مشہور ہے کہ خود شعر کہتے وقت اکثر اوقات زار و قطار رویا کرتے تھے - اور یہ بھی کان سے عند الطلب شعر نہیں کہلوائے جا سکتے تھے

جب تک اِن پر وہ خاص کیفیت طاری نہ ہو۔ اور جب طاری ہو تو بیسیوں اشعار ایک وقت میں کہہ جاتے تھے۔
اِس سے مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا ہے کہ حالانکہ وہ پڑھاتے وقت کتاب کے مضمون ہی سے سروکار رکھتے تھے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہُوا کہ سبق چھوڑ کر گویا جماعت سے باتیں کرنے لگ گئے۔ جو نظم وہ پڑھا رہے تھے اُس میں ایک مصرع کے یہ معنے تھے کہ شاعر کے لئے زبان کے الفاظ اظہارِ خیالات کو کافی نہیں ہوتے۔ اِقبال کتاب کی طرف سے نگاہ اُٹھا کر جماعت سے مخاطب ہو گئے اور فرمایا کہ آپ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ شاعر کے دماغ میں جس وقت آمد ہوتی ہے تو اُس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ خیالات ایک طوفان کی طرح اُمڈے چلے آتے ہیں۔ اِس کو ہر خیال کے لئے پہلے الفاظ تلاش کرنا پڑتے ہیں۔ پھر عروض اور قافیہ ردیف کے مرحلوں کو طے کرنا پڑتا ہے اِس کے بعد ایک شعر بنتا ہے۔ اِس وقت تک درجنوں ایسے خیالات بھول کر ضائع ہو جاتے ہیں جو اگر شعر میں آ جاتے تو اس مخصوص شعر سے شاید کہیں بہتر ہوتے۔ شاعر بعض اوقات سخت بےچین ہوتا ہے اور تڑپتا ہے کہ اظہارِ خیال کے لئے اِسے الفاظ نہیں ملتے۔ یا ملتے ہیں تو وہ اِس خاص بحر یا قافیہ یا ردیف میں ادا نہیں ہو سکتے جس میں نظم یا غزل لکھی جا رہی ہے۔

آخر میں میں یہ کہوں گا کہ اقبال فرشتہ نہیں تھا۔ تھا تو اِنسان ہی۔ مع انسانیت کے دیگر لوازمات کے، لیکن بڑی خوبیوں کا انسان تھا۔ اور نبی تو نہیں لیکن اللہ کی طرف سے پیغامبر ضرور تھا۔ جس موثر طریق سے اُس نے یہ پیغام اسلامی دُنیا تک پہنچایا ہے۔ کوئی پہنچائے گا تو جانیں گے۔

رامپور۔ ستمبر ۱۹۴۵ء

عطاالرحمٰن

اِقبالؔ

اور

ابنِ عربیؒ [1]

انگلستان کے مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن نے جنہیں مسلم اربابِ فکر خصوصاً صوفیا کے خیالات پر براہِ راست اور ماہرانہ عبور ہے ترجمہ "اسرارِ خودی" [2] کے دیباچے میں بیان کیا ہے کہ "اقبال کا فلسفہ بڑی حد تک نطشے اور برگسان سے ماخوذ ہے

---

[1] ابنِ عربی مسلم متصوفین میں پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اسلامی افکار کی "وحدت الوجود" کے تحت تشریح کی ہے اور اس نظریہ کو ایک نظام کی صورت میں مرتب کیا ہے۔ اگرچہ شیخ کے متعلق علما میں اختلاف ہے کوئی اُن کو ملحد اور کافر کہتا ہے کوئی ان کو قطب اور ولی اللہ مانتا ہے بعض بزرگ اُن کے حق میں سکوت بہتر سمجھتے ہیں لیکن جہاں تک اُن کی شخصی عظمت، ماہرانہ وسعتِ نظر اور غیر معمولی ذکاوت کا تعلق ہے کسی کو اختلاف نہیں۔ محمد بن علی بن محمد نام ہے، محی الدین لقب، ابنِ عربی کنیت اور حاتمی طائی نسبت ہے۔ شیخ اکبر اور ابنِ عربی کے ساتھ مشہور ہیں۔ دوشنبہ کے روز ۱۷ رمضان ۵۶۰ھ کو مرسیہ میں پیدا ہوئے سات آٹھ سال کی عمر میں اشبیلیہ آئے اور یہاں مروجہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ زمانہ تک والیٔ اندلس کے کاتب رہے ۵۹۸ھ میں حج کے ارادے سے مشرق کا رخ کیا اور پھر کبھی مغرب کی صورت نہ دیکھی۔ مصر، حجاز، بغداد، موصل اور ایشیائے کوچک کی سیاحت کرتے رہے۔ اس دوران میں افادے، استفادے اور تصنیف و تالیف کا شغل بھی جاری رہتا تھا۔ ۲۸ ربیع الآخر ۶۳۸ھ پنجشنبہ کی رات کو دمشق میں اس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔ کوہ قاسیون کے دامن میں دفن ہوئے۔ یہ مقام اب صالحیہ کہلاتا ہے۔ مشہور ترکی فاتح سلطان سلیم نے اُن کی قبر پر عمارت بنا کرا دی اور اس کے لئے وقف مقرر کیا۔ آجکل شیخ کی قبر عام زیارت گاہ ہے۔ مختلف علوم و فنون میں شیخ کی سیکڑوں مختصر اور طویل کتابیں اور رسائل ہیں ان میں فصوص الحکم اور فتوحاتِ مکیہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

[2] ترجمہ "مثنوی اسرارِ خودی" از نکلسن۔

میرے مخلص دوست مسٹر چھوٹے لال جوہری نے ڈاکٹر نکلسن کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اقبال کے فلسفے کے سلسلے میں صرف مغربی فلسفیوں کو سامنے رکھنا اور انہیں کے افکار کو اقبال کے فلسفے کا ماخذ قرار دینا "فلسفۂ عجم" کے مصنف کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے" [۵۱] زیر نظر مقالے سے مقصود اقبال کے تقابلی مطالعے کے ساتھ ساتھ جوہری صاحب کی مذکورہ بالا رائے کی تائید بھی ہے۔ اس موقع پر میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اقبال اور ابن عربی کی بعض خیالات میں ہم آہنگی دکھانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ابن عربی کے خیالات کو اقبال کا ماخذ سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر نکلسن کے بقول محض افکار کی مشابہت اخذ و اقتباس کی دلیل نہیں ہوتی الا یہ کہ تاریخی شہادتیں کسی ایک کو دوسرے کا ماخذ ثابت کر دیں۔[۵۲]

اقبال اور ابن عربی کے بعض اہم مابعد الطبیعیاتی خیالات میں غیر معمولی مشابہت ہے لیکن یہ مشابہت زیادہ بنیادی نہیں۔ جہاں تک اس کا تعلق ہے دونوں کے نظام الگ الگ ہیں۔ اقبال نے زندگی کی توجیہ حرکت سے کی ہے۔ اس میں خالق اور مخلوق، جوہر اور عرض کسی کا بھی استثنا نہیں۔ ابن عربی کے نزدیک زندگی کی بنیاد ایک مجہول الکنہ حقیقت ہے۔ اقبال کے نظام میں خودی یا انانیت اور شخصیت کو خصوصی اہمیت ہے۔ ابن عربی کے تصوف میں اس کا کوئی خاص درجہ نہیں۔ اقبال ذات باری کو متعین شخصیت تسلیم کرتے ہیں۔ اور ابن عربی مرتبۂ ذات کو مجہول الکنہ مطلق اور مبہم وحدت۔ اقبال کے نزدیک کائنات مجموعہ ہے منفرد شخصیتوں کا اور ابن عربی کے نزدیک مبہم اور مطلق ذات کے تعینات اور تخصیصات کا۔ علاوہ ازیں کائنات خصوصاً انسانی وظائف حیات کے متعلق دونوں کے زاویۂ نظر مختلف ہیں۔ تنازع للبقا اور عملی جد و جہد اقبال کے فلسفے کا اہم جزء ہے ان کے نزدیک زندگی کے میدان میں تصادم اور تنازع خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اقبال کا فلسفہ ہی عمل اور جد و جہد کا فلسفہ ہے ابن عربی کے یہاں جد و جہد اور حیات کے لئے تنازع اور تصادم کوئی خصوصی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان اساسی اختلافوں کے باوجود دونوں کے نظام میں بعض اہم خصوصیتیں مشترک بھی ہیں۔ مثلاً دونوں کے خیالات اور نظریات کی بنیاد مادی اور طبعیاتی تجربوں کے بجائے وجدانی یا روحانی تجربات حیات پر ہے۔ دونوں نے اپنے اپنے عہد کے طبعیاتی نظریے سے چشم پوشی کرنے کے بجائے ان کو اپنے اپنے نظام میں جذب کر لینے کی کوشش کی ہے، دونوں کے افکار کی بناء

---

۵۰ ملاحظہ ہو رسالہ "پیغام حق" ۵۱ جلد ۵ ماہ اکتوبر ۱۹۶۱ء ۵۲ تاریخ ادبیات عرب از نکلسن صفحہ ۳۳۴۔

رُوحانی اور وجدانی تجربات پر ہے، کائنات اور حیات کی اصل اور جوہر دونوں کے نزدیک ایک قسم کی روحانیت ہے، طبعیاتی یا مادی نظریوں کو دونوں نے پیشِ نظر رکھا ہے اس لئے دونوں نے مادہ اور مادیت کی واقعیت تسلیم کی ہے اور طبعیاتی علل و اسباب کی اہمیت کو مانا ہے ہاں یہ صحیح ہے کہ مادیت کے علم برداروں کی تقلید میں اُن کو اساسی حیثیت نہیں دی ہے۔

اقبالؔ اور ابن عربی کی عام خصوصیات سمجھنے کے لئے غالباً مذکورہ بالا بیان کافی ہے۔ ذیل میں دونوں نظاموں کے متشابہ مابعد الطبعیاتی خیالات مع اُن کے باہمی امتیازات کے پیش کئے جاتے ہیں۔

ذاتِ باری، کائنات اور تخلیق۔ } اقبالؔ کے نزدیک ذاتِ باری متعین شخصیت ہے جس میں شعور، ارادہ اور بامقصد فاعلیت سب شامل ہیں۔ یہ ذات لامحدود اور غیر متناہی امکانات پر مشتمل ہے۔ یہ امکانات خود باری تعالیٰ کے افعال و شئون ہیں جو اُس کی ذات میں پوشیدہ ہیں اِن افعال و شئون کو یا امکانات کو علم و ارادے کے ساتھ ظاہر کر دینا اور موجود بنا دینا خلق اور آفرینش ہے [۱]

آفریدن جستجوئے دلبرے وانمودن خویش را بر دیگرے
ایں ہمہ ہنگامہائے ہست و بود بے جمال ما نیاید در وجود

یہی افعال و شئون ظاہر اور موجود ہو جانے کے بعد کائنات ہے [۲]

کفِ خاکے کہ دارم از درِ اوست گل دریحانم از ابرِ تر اوست
نہ "من" را می شناسم من نہ "او" را دلے دانم کہ "من" اندر بر اوست

اشیاء یا موجودات وجود سے پہلے اپنی امکانی حیثیت میں بھی باہم دگر ممتاز ہیں مگر اُن کا امتیاز کمیت اور مقدار کے اعتبار سے نہیں ہے کیونکہ قبل از وجود کمیت اور مقدار رکھنے کے کوئی معنی نہیں۔ ان کی حیثیت باری تعالیٰ کے لئے کیفیات کی سی ہے۔ اور اُن کا باہم دِگر امتیاز اور فرق محض کیفی ہے [۳]

---

[۱] مقدمہ "اسرار خودی" انگریزی ص۱۷ خطبات صفحہ ۷۵، ۸۱، ۸۲، ۸۷، ۹۰، ۹۳، ۹۹، ۱۰۶، ۱۰۷
[۲] ایضاً صفحہ ۱۸، ۹۰، ۹۱، ۱۰۹
[۳] ایضاً صفحہ ۶۵

ابنِ عربی ذاتِ باری کو مجہول الکنہ اور مبہم و مطلق حقیقت مانتے ہیں۔ ہر قسم کے اعتبارات اور تعینات سے بلند۔[۹۴] یہ ذات اپنے تنزلات کے اعتبار سے مختلف صفات اور تعینات کی حامل ہے۔ ذات کے یہ تعینات وصفات ذات کے افعال و شئون ہیں۔ کائنات بھی باری تعالیٰ کے شئون اور افعال یا اُس کے تعینات سے علیحدہ کوئی شئے نہیں۔[۹۵] یہ افعال و شئون اپنے موجود ہونے سے پہلے امکانات کی صورت میں ذاتِ باری میں مضمر اور ثابت ہیں۔ ان کا ثبوت ایک قسم کا علمی ثبوت ہے۔ گویا یہ اشیاء کی علمی صورتیں ہیں۔ ان علمی صورتوں کو شیخ "اعیانِ ثابتہ" کہتے ہیں۔[۹۶] موجود ہونے سے پہلے اعیانِ ثابتہ کی کوئی مقدار اور کمیت نہیں۔ بلکہ اُن کی حیثیت کیفیات کی سی ہے۔[۹۷] یہ اعیان اپنی اس کیفی حیثیت میں بھی باری تعالیٰ کے لئے ممتاز ہیں۔ جہاں تک اپنے آپ کے لئے ان کے ممتاز ہونے کا تعلق ہے وہ اُن کے موجود ہونے پر منحصر ہے۔[۹۸] اعیانِ ثابتہ کا ظاہر اور موجود ہونا باری تعالیٰ کے ارادے اور علم پر موقوف ہے۔ باری تعالیٰ کا اپنے علم و ارادے کے تحت ان کو حاضر کر دینا اور موجود بنا دینا ہی خلق اور آفرینش ہے۔[۹۹]

اقبال اور ابنِ عربی دونوں قائل ہیں کہ باری تعالیٰ کے ظاہر ہونے کے معنیٰ یہی ہیں کہ اس کے افعال اور شئون ظاہر ہو جائیں۔ کیوں کہ یہ پوشیدہ صلاحیتیں اور امکانات جن پر ذات مشتمل ہے ذات کی اپنی صلاحیتیں ہیں۔ جو خارجی عالم میں موجود ہو کر کائنات کہلاتی ہیں۔ لہذا اُن کا ظاہر ہونا خود ذات کا ظاہر ہونا ہے۔ اقبال اور ابنِ عربی دونوں قائل ہیں کہ یہ ظہور یا اظہارِ ذات، ذات کا اپنا ذاتی تقاضہ ہے۔[۱۰۰]

حق ہویدا با ہمہ اسرارِ خویش
بانگاہِ من کند دیدارِ خویش

وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

کائنات میں تغیر اور حرکت کے اقبال اور ابنِ عربی دونوں کائنات کو جامد اور ٹھیرا ہوا نہیں سمجھتے۔ بلکہ کائنات اور اُس کی ہر چیز لامحدود

---

۹۴ فتوحات مکیہ جزاول ص ۱۳۱ ۹۵ فصوص الحکم، فصوص الکلمۃ الانبیاسیہ فی الحکمۃ لباسیہ، فص الکلمۃ اسمٰعیلیہ فی الحکمۃ الشعیبیہ ۹۶ کتاب الاجوبہ من المسائل المنصوریہ، سوال ۴۳ ۹۷ فتوحات جزسوم ص ۱۱ کتاب الاجوبہ سوال ۸۸ ۹۸ فتوحات جزسوم ص ۱۹۳ ۹۹ ایضاً جزاول ص ۱۰۰، ۱۳۲ جز سوم ص ۲۵۴ ۱۰۰ ص ۹، ۹۸، ۹۹ کتاب الاجوبہ سوال ۵۸ رسالۃ الاحدیۃ، فصوص، الکلمۃ الانبیاسیہ فی الحکمۃ الیناسیہ، فتوحات جزدوم ص ۲۴ — ۳۱۰ --

تغیرات اور ان گنت تبدیلیوں کا ایک سلسلہ ہے۔

اے من و تو موجے از رودِ حیات　　ہر نفس دیگر شود ایں کائنات
زندگانی انقلاب ہر دمے است　　زانکہ او اندر سراغ عالمے است

اقبال کہتے ہیں کہ تغیر اور تبدیلیاں ارتقائی ہیں یعنی کائنات کو مسلسل بہتری اور برتری کی طرف بڑھائے لئے جا رہی ہیں۔ کائنات ناقص سے کامل اور کامل سے کامل تر کی طرف حرکت کر رہی ہے[1]۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید　　کہ آرہی ہے دمادم صدائے "کن فیکون"

ابن عربی نے جہاں تک میری محدود تلاش اور تفحص کا تعلق ہے کائنات کی تبدیلیوں اور تغیروں کے ارتقائی ہونے کی صراحت نہیں کی ہے لیکن جیسا کہ آئندہ آئے گا وہ عالم آخرت کو کائنات کے سلسلہ تغیرات کی ہی ایک کڑی مانتے ہیں۔ اور عالم آخرت کا دنیا کے مقابلے میں برتر اور بہتر ہونا عام مسلمہ عقیدہ ہے اس لئے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کائنات کی تبدیلیوں اور تغیروں کا ارتقائی ہونا اُن کو بھی تسلیم ہے۔ ہاں ان تغیروں اور تبدیلیوں کی نوعیت دونوں کے یہاں الگ الگ ہے۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ عالم کا جوہر اور مادہ یکساں قائم اور باقی رہتا ہے اور اس پر مختلف صورتیں مسلسل آن بعد آن آتی جاتی رہتی ہیں۔ پہلی صورت فنا ہو جاتی ہے اور دوسری نئی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا نام "کون و فساد" ہے[2]۔ اقبال کے نزدیک کائنات نام ہے فقط حرکت کا۔ کائنات کی اصل اور اس کا جوہر اور مادہ حرکت ہے اور بس۔ اس کو یا اس کے مادے کو جامد شئے سمجھنا فکر کا قصور ہے[3]۔

زندگانی از خرامِ پیہم است　　برگ و سازِ ہستی موج از رم است

نکہ خامِ تو گراں خیز است و لنگ　　تہمت گل بست بر پرواز رنگ
زندگی مرغِ نشیمن ساز نیست　　طائر رنگست و جز پرواز نیست

---

[1] خطبات ص ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۱۴۷، ۱۲۵　[2] فتوحات جزو دوم ص ۴۵۴؛ ایضاً جزو سوم ص ۲۵۴　[3] خطبات ص ۶۹، ۷۰، ۴۴، ۱۴۲، ۱۴۳، ۹۵۹

چنانچہ اُن کے نزدیک کسی مادّے یا جوہر کے قایم اور باقی رہنے کے اور اُس پر صورتوں یا اعراض کے مسلسل پیدا یا فنا ہوتے رہنے کے کوئی معنی نہیں - تغیر کی حقیقت اتنی ہے کہ زندگی اور وجود کی لہریں متواتر آگے بڑھتی جا رہی ہیں - اور نئے نئے عالم ظہور پذیر یا پیدا ہوتے جا رہے ہیں[1]

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

تغیر کی یہ نوعیت ماننے کی وجہ سے اقبال کے نزدیک کائنات میں کسی چیز کا اعادہ اور کسی قسم کی تکرار ممکن نہیں[2]

چیست آئینِ جہانِ رنگ و بو
جز کہ آبِ رفتہ می ناید بجو

زندگانی را سرِ تکرار نیست
فطرتِ او خوگرِ تکرار نیست

ابنِ عربی کے نزدیک اعادہ اور تکرار ممکن ہے - لیکن اتنا نہیں بھی تسلیم ہے کہ اعادے اور تکرار کا امکان محض عقلی اور منطقی امکان ہے - ورنہ حقیقت یہی ہے کہ اعادے اور تکرار کا وقوع کبھی نہیں ہوتا بلکہ کائنات میں جدید تخلیق کا عمل جاری ہے - ہمیشہ نئی نئی چیزیں ظاہر ہوتی ہیں[3]

کائنات میں حیات اور شعور - چونکہ ابنِ عربی قائل ہیں کہ کائنات باری تعالیٰ کا ظہور اور تجلی ہے، کائنات کا وجود خود باری تعالیٰ کا وجود ہے - اور حیات، باری تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے - لہذا کائنات میں کوئی نوع، کوئی صنف اور کوئی فرد حیوانات سے تعلق رکھتا ہو یا نباتیات و جمادات سے، حیات و شعور سے خالی نہیں - یہ دوسری بات ہے کہ اُن کی زندگی ہمیں محسوس نہ ہو - اتنا ہی نہیں بلکہ ہر شئے اُس مقصد کو سمجھتی ہے جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے - اور پورا کرتی ہے - اس کے لئے شیخ کے نزدیک فقط انسان اور جنات مستثنیٰ ہیں اگر کائنات میں سے کسی ایک شئے کی بھی زندگی کو تسلیم نہ کیا جائے تو اُس کی ہستی کا باری تعالیٰ کی زندہ ہستی سے کوئی تعلق قایم نہیں رہتا حالانکہ باری تعالیٰ کی

---

[1] خطبات صفحہ ۱۷۹ ، [2] ایضاً صفحہ ۹۸ / مقدمہ صفحہ ۲۴ ، [3] فتوحاتِ جزو اول صفحہ ۱۴۳ -

ہستی کے علاوہ شیخ کے نزدیک کائنات کی کوئی ہستی نہیں - اور چونکہ علم و شعور لازمۂ حیات ہیں لہٰذا ہر شئے زندہ ہونے کے ساتھ ساتھ باشعور بھی ہے[1]۔

اقبال کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ کے افعال حرکتوں کی صورت میں مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں - یہ حرکتیں تخلیق ہیں جن سے اور دوسرے افعال یا حرکتیں ظہور پذیر ہو رہی ہیں - ان حرکتوں کے اختلاط اور ترکیب سے ہی کائنات کا ظہور ہوا ہے اس میں مادہ بھی شامل ہے اور روح بھی[2]۔

گم شدم اندر ضمیر کائنات — چوں رباب آمد بچشم من حیات
آنکہ ہر تارش رباب دیگرے — ہر نوا از دیگرے خونیں ترے
ہمہ یک دود مان نار و نور — آدم و مہر و مہ و جبریل و حور

وہ کہتے ہیں کہ "فطرت یا نیچر کو زندہ یا دائمی اور بڑھتی ہوئی عصویت سمجھنا چاہئے" ان کے نزدیک "فطرت یا نیچر" جیسا کہ عام مادیین کا خیال ہے "خالص مادیت کا تودہ نہیں جو عالم کے خلاء بسیط کو پُر کئے ہوئے ہے" "نیچر اور فطرت حقیقتاً خود "واقعات کی ایک تالیف ہے اور کردار کا ایک منظم طرز اور اپنی اس حیثیت کی بنا پر انا مطلق کا ایک عضوی جزء"[3] روح اور مادے کی نوعیت ایک ہی ہے - دونوں میں محض صنفی فرق ہے - دونوں کی تالیف یکساں ہے جو ایک کے عناصر ہیں وہی دوسرے کے چنانچہ نہ جسم کوئی ایسی شئے ہے جو خلاء عالم میں خلق ہو اور نہ جان - جسم کی کائنات میں حیثیت کیا ہے؟ "وہ واقعات یا افعال کا ایک نظام ہے" جان یا انا یا ہمارے شعور اور تجربات کا ایک خصوصی نظام، اس کی حیثیت کیا جسم سے کچھ مختلف ہے؟ - اقبال کا جواب ہے کہ نہیں بلکہ "وہ بھی افعال کا ہی ایک نظام ہے" جسم اور جان میں بس اتنا فرق ہے کہ "جسم ایک مجتمع فعلیت ہے" اور "شعور کا ایک جامد عنصر ہے"[4] - مزید برآں اقبال مادہ اور روح دونوں کی واقعیت تسلیم کرتے ہیں اور واقعیت کا دارومدار شعور پر ہے ان کے نزدیک "صرف وہی شئے واقعیت رکھتی ہے جس کو اپنی واقعیت کا براہ راست شعور ہو" - یہ صحیح ہے کہ واقعیت ایسی صفت نہیں جو کائنات کی ہر چیز میں یکساں اور مساوی طور پر

---

[1] فتوحات جزء سوئم صفحہ ۳۲۴، ایضاً جزء دوئم صفحہ ۴۵۷، [2] خطبات صفحہ ۶۹، [3] خطبات صفحہ ۷۶-۷۷
[4] خطبات صفحہ ۱۴۷۔

پائی جائے - بعض چیزیں زیادہ واقعی ہوتی ہیں اور بعض کم اس زیادتی اور کمی کی بنیاد شعور کی کمی اور زیادتی پر ہے[1] - کائنات کی اِس تشریح کے مطابق اقبال کے نزدیک بھی کائنات کے ہر مظہر یا ہر شئے کو کم و بیش حیات و شعور پر مشتمل ہونا چاہیے کیونکہ وہ ایک ہی خلاق اور زندہ حرکت یا فعلیت کا تالیفی حصہ ہے جو مسلسل رواں ہے[2] - علاوہ ازیں چونکہ اقبال کے نزدیک بھی کائنات حقیقتہً باری تعالیٰ کی ہستی کی تجلی اور اُس کا ظہور ہے - ایک کی ہستی دوسرے کی ہستی سے الگ نہیں فقط خارجی اور داخلی حیثیت کا فرق ہے[3] - باری تعالیٰ حیاتِ صرف اور شعورِ محض ہے - اِس لئے کائنات یا اُس کے کسی جزء سے حیات یا شعور کو کسطرح علیحدہ کیا جاسکتا ہے -

خودی را از وجود حق وجودے ⁂ خودی را از نمود حق نمودے

نمی دانم کہ ایں تابندہ گوہر ⁂ کجا بودے اگر دریا نبودے

کائنات کا حدوث و قدم

اقبال اور ابن عربی دونوں عمل تخلیق کو ازلی اور ابدی تسلیم کرتے ہیں - لہٰذا اس کے اثر یعنی کائنات کا ازلی اور ابدی ہونا ناگزیر ہے - نہ جانب ماضی میں کوئی ابتدا ہے اور نہ سمت استقبال میں کوئی انتہا - کائنات باری تعالیٰ کے ساتھ ہے اور اُس کے ساتھ ہی رہے گی -

زخضرا ایں نکتۂ نادر شنیدم ⁂ کہ بحر از موج خود دیرینہ تر نیست

کائنات جو دونوں کے نزدیک باری تعالیٰ کا ظہور اور اُس کی تجلی ہے باری تعالیٰ ذاتی خواہش کا معلول اور نتیجہ ہے - اس ضمن میں وہ امکانات اور صلاحیتیں بھی جن پر باری تعالیٰ کی ذات مشتمل ہے خود نمائی اور ظہور کو چاہتی ہیں کیونکہ خود نمائی اور مظاہرہ ہر شئے کی فطرت ہے -

نہ کر ذکر فراق و آشنائی ⁂ کہ اصل زندگی ہے خود نمائی

تار و پود ہر وجود از رفت و بود ⁂ ایں ہمہ ذوق نمود از رفت و بود

---

[1] ایضاً صفحہ ۱۰۰ [2] خطبات صفحہ ۷۵ [3] ایضاً صفحہ ۹۸، ۹۹، ۷۷

چنانچہ نہ ذات باری سے اُس کی ذاتی خواہش الگ ہو سکی ہے اور نہ صفت تخلیق میں کبھی تعطل آسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں قائل ہیں کہ یہ تخلیقی عمل باری تعالیٰ کے ارادے اور علم کے تحت واقع ہوتا ہے۔ ہاں باری تعالیٰ کے مرتبۂ ذات میں کائنات کے وجود کا کوئی قائل نہیں۔ ذات یا اُس کی ایک حیثیت محض صلاحیتوں اور امکانات پر مشتمل ہے۔ جو اجمالی وجود رکھتے ہیں اور امکانات کے محض اجمالی وجود کا نام کائنات نہیں۔

ابن عربی کہتے ہیں کہ کائنات اپنی مجموعی اور کلی حیثیت میں قدیم ہے۔ جہاں تک اُس کے شخصی اور نوعی درجات کا تعلق ہے ہر نوعی اور ہر شخصی درجہ اور اس ضمن میں ہر شے حادث ہے۔ اگرچہ خود ان حادث درجات کی کوئی ابتدا نہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ باری تعالیٰ کسی وقت موجود ہو اور کائنات کا کوئی درجہ موجود نہ ہو۔ اور صفت تخلیق بالکل معطل اور مفقود ہو۔ اسی طرح ان درجات کی کوئی انتہا بھی نہیں یعنی یہ ممکن نہیں کہ کسی وقت باری تعالیٰ کا وجود تو باقی ہو اور عالم کا کوئی درجہ باقی نہ رہے اور وہ تمام امکانات اور صلاحیتیں جن کے ظہور سے کائنات کے وجود کی تشریح کی جاتی ہے۔ بالکل ختم ہو چکیں۔

اقبال کی تشریح کے مطابق کائنات غیر محدود امکانات اور صلاحیتوں کی صورت میں باری تعالیٰ کی ذات میں مضمر ہے اور ذات کی خواہش ظہور کے باعث مسلسل وجود میں آرہی ہے۔ اُس کے وجود میں آنے کے معنی یہی ہیں کہ تخلیقی حرکت پیہم آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اِس تخلیقی حرکت کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ کوئی انتہا۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک ہے: دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

انسانی عقل ہی کی خاصیت یہ ہے کہ اشیاء کو اُن کی ظاہری اور بیرونی صورت میں جامد اور غیر متحرک بنا کر دیکھے۔ اشیاء کی اسی مسلسل روانی اور دائمی سیلان سے زمانے کا متعارف مفہوم استخراج کر لیتی ہے۔ قدامت اور حدوث کے تصورات کا مدار اسی عرفی زمانے پر ہے۔ چنانچہ کائنات میں جو بھی خاص اشیا فرض کی جائیں یعنی اس مسلسل تخلیقی روانی کو ساکن بنا کر اس کے حصے کر لئے جائیں اور اُن میں سے کوئی خاص حصہ فرض کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں کائنات کی کوئی حیثیت یا اُس کا کوئی درجہ سامنے رکھا جائے تو معروف زمانے کے اعتبار سے وہ اشیا یا وہ حصہ اور درجہ یقیناً حادث ہے یعنی اُس کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ لیکن پوری لامحدود کائنات جو عبارت ہے مسلسل حرکت اور متواتر روانی سے اپنی مجموعی اور کلی حیثیت میں قدیم ہے جس کا نہ آغاز اور

نہ اختتام[1]

موت اور برزخی اور اُخروی حیات

اقبال اور ابن عربی دونوں متفق ہیں کہ نہ انسان کی شخصی حیات فنا ہونے والی شئے ہے اور نہ موت زندگی کا اختتام ہے۔

ازل اُس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اُس کے پیچھے نہ حد سامنے

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا — ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

ابن عربی کہتے ہیں کہ موت کی حقیقت بس اتنی ہے کہ ایک زندہ چیز دوسری زندہ چیز کی تدبیر سے ہاتھ اُٹھا لیتی ہے۔ چونکہ جسم روح سے علیحدہ بھی زندگی رکھتا ہے اور روح خود بھی ایک زندہ حقیقت ہے متعارف زندگی یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اس طرح کہ رُوح سے جسم کی تدبیر متعلق ہے اور رُوح کا جسم کی تدبیر سے دستکش ہو جانا موت ہے[2] اس سلسلہ میں اقبال کا نظریہ وجود کی اساسی توجیہ پر مبنی ہے۔ اقبال کے خیالات کا حاصل یہ ہے کہ افراد اور اشخاص کو اس ماحول میں رہنے کی وجہ سے موجودہ ماحول سے اُنس اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اُن کی پوری زندگی اور اس کے اعمال اور تاثیریں اسی ماحول کے مطابق ڈھل جاتی ہیں اور ہر شئے کے متعلق شعور کا ایک خاص زاویہ نظر پیدا ہو جاتا ہے لیکن چونکہ کائنات کا یہ ماحول اُن کی ترقی کے اُن تمام امکانات کو جو اُن میں مضمر ہیں بروئے کار لانے کے لئے کافی نہیں ہوتا بلکہ اُس کی صلاحیتوں کے پھلنے پھولنے کے لئے دوسرے میدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس دوسرے میدان اور ماحول میں داخل ہونے کے لئے زندگی کے لئے اس میدان اور ماحول سے الگ ہونا ناگزیر ہے چونکہ زندگی پوری طرح اس ماحول سے مانوس ہوتی ہے اور اُس کی تمام فعلیتیں اسی ماحول کے مطابق ڈھلی ہوئی ہوتی ہیں لہذا اس سے الگ ہونا سہل نہیں ہوتا بلکہ سخت قسم کی کشمکش اور تصادم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کشمکش اور صدمے کا نام موت ہے[3]

---

[1] خطبات ص ۷۶، ۷۷، ۸۲، ۹۰، ۹۲، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۲۱، فتوحات جزء سوم ص ۳۹۶ جزء دوم ص ۵۵ جزء سوم ص ۱۷۸

[2] فتوحات مکیہ جزء سوم ص ۳۲۴ [3] خطبات ص ۴

ہوا جب اُسے سامنا موت کا　　کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا

ابنِ عربی نے اگرچہ اِس کی صراحت نہیں کی ہے کہ رُوح اُس خاکی جسم کی تدبیر سے کیوں دست بردار ہو جاتی ہے لیکن برزخی اور اُخروی حیات کے متعلق اُنھوں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم سے رُوح کے قطع تعلق کی وجہ اُن کے نزدیک بھی یہی ہے کہ انسان کی بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کے لئے اس خاکی جسم کی صورت نہیں رہتی - یا یہ کہ اِس کے ساتھ مزید وابستگی اُس کی ترقی میں حارج ہونے لگتی ہے - لہٰذا اِس جسم کو چھوڑنا پڑتا ہے -

اِقبالؔ کہتے ہیں کہ موجودہ ماحول سے نکلنے کا صدمہ جو موت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اتنا شدید ہوتا ہے کہ اُس کو تمام موجودات یکساں برداشت نہیں کر سکتے -

چوں حیات عالم از زور خودی است　　پس بقدر استواری زندگی است

کائنات کی وہ شخصیتیں جن کی تالیف اور ترکیب محکم نہیں ہوتی اِس صدمہ سے بالکل منتشر اور متفرق ہو جاتی ہیں اور اُن کی تالیفی ہیئت فنا ہو جاتی ہے[۱] صرف مستحکم تالیف والی شخصیتیں اُس کو جھیل جاتی ہیں -

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر　　یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

لیکن ضعف اور اضمحلال سے وہ بھی نہیں بچتیں - اقبالؔ کے نزدیک یہ ضعف اور اضمحلال کا وقفہ ہی برزخی حیات ہے - یہ وقفہ ایک حیثیت سے آئندہ مناظر اور آئندہ ماحول کے لئے تربیت کا وقفہ بھی ہے - زندگی کے اُس درجے میں حقیقت کے نئے مناظر اور نئے رُخ محسوس ہونے لگتے ہیں اور بدلے ہوئے ماحول کے ہلکے اثرات نمایاں ہونا شروع ہو جاتے ہیں - چنانچہ شخصیتیں اس درجۂ حیات میں اپنے آپ کو نئے ماحول کے مطابق بنانے کی اور اپنے آپ میں نئے مناظر کو محسوس کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی جد و جہد شروع کر دیتی ہیں - حشر پر زندگی کا یہ دور ختم ہو جاتا ہے اور اُخروی زندگی شروع ہوتی ہے[۲]

---

[۱] مقدمہ ص ۲۴

[۲] خطبات ص ۱۶۶

منتشر اور فنا کرنے والی قوتوں کا مفتوح ہو جانا اور اُن تمام موانع اور عوائق کا مغلوب ہو جانا جو زندگی کی مزید ترقی میں حائل ہیں ۔ اور آزادی کے ساتھ اِنسان کی بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کا پھلنا پھولنا جنت ہے ۔ دُنیاوی اعمال کی وجہ سے جو شخصیتیں جامد اور بے حس ہو چکی ہیں اور اپنے آپ کو اُس ماحول کے مُطابق نہیں بنا سکی ہیں اُن کا اپنے آپ کو حساس بنانے کی جدو جہد کرنا جہنم ہے[1]

ابنِ عربی کے یہاں برزخی اور اُخروی حیات کے متعلق اگرچہ اِتنی دقیق تفصیل نہیں ہے لیکن اُن کے خیالات کی رفتار بھی بعینہٖ یہی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت بالکل نئے یا ایک دوسرے سے علیحدہ عالم نہیں بلکہ اسی عالم کے مسلسل اور نہ ختم ہونے والے تغیرّوں اور تبدیلیوں میں سے خاص تغیرات اور تبدیلیاں ہیں[2] "اِنسانی تخم اِس دنیاوی عالم میں پڑتا ہے" اور وہ دنیاوی بطن میں نشوونما پاتا رہتا ہے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ اِس عالم میں اُس کا نشوونما اُس حد تک ہو سکتا ہے جس حد تک دُنیاوی بطن میں ممکن ہے ۔ چنانچہ جس طرح ماں کے پیٹ میں انسانی نشوونما کی تکمیل نہیں ہو سکتی اُسی طرح دُنیا کے پیٹ میں بھی اُس کے نشوونما کی تکمیل نہیں ہو سکتی ۔ تکمیل کے لئے دُوسرے عالم میں جانا پڑتا ہے" وہ اِس بطن سے نکل کر عالمِ برزخ میں داخل ہوتا ہے ۔ یہ عالم اُس کا مولد ہے ۔ وہاں اُسکی روزِ حشر تک اُسی طرح تربیت ہوتی ہے جیسے بچے کی" جب نشوونما کی تکمیل ہو چکتی ہے تو اُخروی حیات کا درجہ آتا ہے ۔ جس میں لوگ ایسی قوت اور طاقت حاصل کر لیتے ہیں جس کے بعد کسی ضعف اور اِضمحلال کا خطرہ نہیں رہتا" ۔ اور وہ اِسقدر تکمیل پا چکا ہوتا ہے کہ" دنیا میں جو چیزیں محض معنوی اور تخیلی حیثیت رکھتی ہیں اُس عالم میں وہ اُس کے لئے محسوس حیثیت اِختیار کر لیتی ہیں"[3] ۔ گویا شیخ کے نزدیک عالمِ آخرت نئے مناظر اور نیا ماحول رکھتا ہے جس کو محسوس کرنے کے لئے خاص قسم کی تربیت اور خاص قسم کی نشوونما کی ضرورت ہے ۔ اِس مخصوص تربیت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اِنسان بالکل نئی قسم کی چیزوں کو محسوس کرنے لگتا ہے جن کو محسوس کرنے کی صلاحیت اِس عالم میں پیدا نہیں ہوتی

---

[1] خطبات ص ۱۷۰
[2] فتوحات جزء سوم ص ۲۵۳
[3] ایضاً جزء چہارم ص ۲۸۲

اور یہ صلاحیت اُس کے لئے اِس عالم میں حاصل ہونا ممکن ہے - مزید برآں اُس کی نشو و نما اِسقدر تکمیل پا چکتی ہے کہ پھر اِنسانی زندگی کے لئے کس قسم کے ضعف اور اضمحلال کا خطرہ باقی نہیں رہتا -

تقدیر اور جبر و اختیار | اقبال اور ابن عربی دونوں کے نزدیک تقدیر کوئی ایسا خارجی نوشتہ نہیں ہے جو چیزوں کو جبراً اُن کی خواہشوں کے خلاف کسی خاص طرف پھیر دیتا ہے بلکہ حقیقتہً تقدیر کا مدار اشیاء کی اپنی ذاتی صلاحیتوں اور استعدادوں پر ہے - ابن عربی کہتے ہیں کہ اشیاء کی علمی صورتیں موجود ہونے سے پہلے باری تعالیٰ کے علم میں ثابت ہیں - اشیاء اپنی ذات کے اعتبار سے مختلف استعدادوں کی حامل ہیں - بعض تغیر پذیر ہیں اور بعض ناقابلِ تغیر - پھر اِن تغیر پذیر اشیاء میں بھی قسم قسم کے تغیروں اور تبدیلیوں کی صلاحیتیں ہیں - اُن میں مختلف اعمال و افعال کے میلانات اور عواطف ہیں - مگر یہ سب اُن کی ذاتی خصوصیتیں ہیں جن میں کسی بیرونی اور خارجی سبب و علت کو دخل نہیں - باری تعالیٰ اِن اشیاء کے ضمن میں اُن کے اُن واقعی حالات سے بھی واقف ہے - اُس کا اشیاء کے متعلق یہی قبل از ایجاد علم اشیاء کی تقدیر ہے - چنانچہ وہ اپنے اِس علم کے مطابق اشیاء کو پیدا یا ظاہر کرتا ہے لہذا جہاں تک تقدیر یعنی اُن کے قبل از خلق علم کا تعلق ہے اشیاء کو مجبور نہیں کہا جا سکتا [۱]

اقبال کا خیال ہے کہ وہ تخلیقی حرکت یا مستمر فعلیت جو وجود کی اساس ہے اپنی مجموعی حیثیت میں ایک بسیط وحدت ہے - یہ بسیط وحدت خارجی عالم میں مسلسل پھیلتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے اُس کے آگے کو پھیلنے اور بڑھنے ہی سے افعال یا اشیاء صورت پذیر ہوتے ہیں - اِس بسیط اور وحدانی حقیقت کا بطن اپنے تمام افعال اور اشیاء کی ذاتی صلاحیتوں پر اور اُن کے ارتقائی امکانات پر مشتمل ہے - چنانچہ اِس وحدت سے اُس کے مسلسل سیلان اور روانی میں جو افعال یا اشیاء صورت پذیر ہوتی ہیں وہ اُن استعدادوں اور قابلیتوں کے تحت ہی ہوتی ہیں جن پر وہ مشتمل ہیں - کیونکہ کوئی چیز اور کوئی فعل اپنی اُس استعداد اور قابلیت سے آگے نہیں بڑھ سکتا جو اُس کی ذاتی ہے - اقبال کے نزدیک اپنی مجموعی حیثیت میں یہ بسیط وحدت جس میں اُس کے افعال کی استعدادیں اور ارتقائی امکانات مخفی ہیں

---

[۱] فتوحات جزو چہارم ص ۱۶ فصوص الحکمۃ القدریۃ فی الکلمۃ العزیزیہ -

تقدیر ہے - گویا تقدیر ایک شئے کی ذاتی اہلیت اور اس کی رسائی کی وہ آخری اندرونی حد ہے جہانتک وہ شئے ترقی کرسکتی ہے -

چہ می پرسی چہ گوں استاد چہ گوں نیست ٭ کہ تقدیر از نہاد او بروں نیست

چہ گویم از چگوں وبیچگونش ٭ بروں مجبور و مختار اندرونش

اقبال کے نزدیک اشیاء کے یہ ارتقائی امکانات غیر محدود ہیں اس لئے اشیاء اپنی حیثیت میں بالکل آزاد ہیں - جن کے بڑھنے کے لئے لامتناہی میدان موجود ہے -

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست ٭ زانکہ تقدیرات حق لا انتہاست

اُن کے لئے پہلے سے مقرر کیا ہوا کوئی منصوبہ نہیں ہے جس کے تحت اُن کو بڑھنا ہے - نہ ایسا ہے کہ کوئی بیرونی طاقت اُنہیں کسی مقررہ سمت میں کھینچے لئے جارہی ہے - تخلیقی حرکت کامل طور پر آزاد ہے - اس سے ظاہر ہونے والے افعال خود اس کے اپنے افعال ہیں جن میں کسی دوسرے کی کوئی ذمہ داری شامل نہیں - اُن کی جو کچھ ذمہ داری ہے وہ اس پر ہے[1]

ابن عربی چونکہ ممکنات کے ذاتی وجود کو تسلیم نہیں کرتے اُن کے نزدیک ممکنات کی ہستی باری تعالیٰ کی ہستی کا سایہ ہے - حقیقی ہستی صرف باری تعالیٰ کی ہے - بنابریں ہر قسم کے افعال اور صفات خواہ اُن میں ممکنات کا توسط ہو یا نہ ہو اپنا وجود نہیں رکھتے - وہ بھی باری تعالیٰ کے افعال اور صفات کا پرتو ہیں - چنانچہ جہانتک تقدیر کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ خود ممکنات کی اپنی صلاحیتوں کے علم کا نام ہے لیکن جہاں تک خود ممکنات کے افعال کا تعلق ہے ممکنات کو مختار نہیں کہا جاسکتا - جبر کے اگر یہ معنی ہیں کہ کسی چیز سے اُس کے ارادے اور خواہش کے خلاف کوئی فعل سرزد کرانا تو اس معنی میں ممکنات میں سے کوئی ممکن مجبور نہیں - اس لئے کہ شیخ کے نزدیک ممکنات کا ارادہ اور خواہش رکھنا بالکل بے معنی ہے - ارادہ اور خواہش صرف خالقِ ممکنات کے لئے سزاوار ہے - کائنات میں صرف

---

[1] خطبات ص ۶۷ ص ۶۹ ص ۷۳ ص ۷۸ ص ۱۰۹ ص ۱۵۳

اسی کی مرضی اور ارادہ کام کر رہے ہیں۔ ہاں اگر جبر کے معنی فقط اتنے ہیں کہ کسی چیز سے بلا اس کے ارادے اور بغیر اس کی خواہش کے کسی فعل کا سرزد کرانا تو اس معنی میں شیخ کہتے ہیں کہ تمام کائنات مجبور ہے[1]

زمانہ اقبال اور ابن عربی دونوں کے نزدیک زمانہ اپنے متعارف معنی کے اعتبار سے کوئی حقیقی ہستی نہیں رکھتا۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ یہ متعارف زمانہ طبعی اجسام کے عوارض اور انتزاعات میں سے ایک عرض اور ایک انتزاع ہے۔ فلک الافلاک (نواں آسمان) یا دوسری وضع اور مقام رکھنے والی چیزوں کی حرکت سے اس کا استخراج اور استنباط ہوتا ہے[2] اقبال اس کو مکانی زماں کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک وضع اور مکان یا مقام رکھنے والی چیزوں کے باہم مکانی تعاقب سے یعنی ان کے یکے بعد دیگرے مسلسل مقام بدلنے سے اس کا استنباط ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اقبال کے نزدیک بھی ہمارے متعارف زمانے کی بنیاد وضع اور مقام رکھنے والی چیزوں کی مکانی حرکت پر ہے۔ یہی وہ وقت ہے جو بہتے ہوئے دریا کی مانند چپ چاپ چلا جارہا ہے۔ اور جو گذر جاتا ہے وہ کبھی واپس نہیں آتا۔

وقت را مثل مکاں گسترده　　امتیاز دوش و فردا کرده

قدم، حدوث، تقدم، تاخر اور معیت کی نسبتیں زمانے کے اس مفہوم سے متعین ہوتی ہیں۔

قدیم و محدث ما از شمار است　　شمار ما طلسم روزگار است

دن، رات، ہفتہ اور ماہ و سال اسی زمانے کے اجزاء ہیں جن کا آفتاب کے طلوع و غروب اور اس کی حرکت سے اندازہ کیا جاتا ہے[3]

در گل خود تخم ظلمت کاشتی　　وقت را مثل خطے پنداشتی

باز با پیمانۂ لیل و نہار　　فکر تو پیمود طول روزگار

اس متعارف مفہوم کے علاوہ اقبال اور ابن عربی دونوں کے نزدیک زمانے کا ایک مفہوم اور بھی ہے۔

---

[1] فتوحات جزو اول ص۴۵ جزو دوم ص۳۵ چہارم ص۳۱۸ [2] فتوحات جزو دوم ص۴۵۸ ایضاً جزو سوم ص۵۴۶ جزو اول ص۳۲۵

[3] مقدمہ ص۲۵ خطبات ص۶۴

زمانہ اپنے اِس مفہوم کے اعتبار سے محض تاثیر اور فعل ہے۔ اِس کو اِس کی باطنی اور اندرونی حیثیت میں "آن" "آب" یا لمح بصر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس آن یا "آب" کی خارجی عالم میں شمسی دنوں کے پیمانے سے مقدار طویل بھی ہو سکتی ہے۔ اقبال اور ابن عربی ان نقطوں پہ متحد ہونے کے باوجود زمانے کے اِس مفہوم کی توجیہ اور تعین میں مختلف ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ ذات سے افعال یا اشیاء کا ظہور اُن کی اپنی استعدادوں کے مطابق مسلسل یکے بعد دیگرے ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہونے والے افعال یا اشیاء بسیط صورت میں ذات میں مضمر ہیں۔ جن کا اپنی باطنی حیثیت میں امتیاز محض کیفی ہے۔ فعال اور ان اشیاء کا ظہور چونکہ تدریجی اور یکے بعد دیگرے ہے لہٰذا ذات کے اندر ان کی یہ ظہوری تدریج بھی کیفی حیثیت میں موجود ہے۔ گویا اشیاء کے ساتھ ساتھ پورا زمانہ بھی بسیط وحدت کی صورت میں مضمر ہے۔ باطنی حیثیت میں اس کی تعبیر ایک آن یا "اب" سے ہی کی جا سکتی ہے۔ ذات کے پھیلنے یا ظاہر ہونے سے جس طرح اشیاء اور افعال پھیلتے اور ظاہر ہوتے جاتے ہیں بالکل اسی طرح یہ بسیط آن بھی پھیلتی اور بڑھتی جاتی ہے۔ اس طرح کہ ماضی مسلسل آگے بڑھتا جاتا ہے جس سے حال اور آگے ایک کھلے ہوئے امکان کی صورت میں استقبال ہوتا ہے۔ زمانہ اپنے تصور کے اعتبار سے بقاءِ محض اور استمرار خالص ہے۔ یہ زمانہ متعارف زمانے کا پابند نہیں۔ بلکہ اس کا خلاق ہے۔ اِس میں ذات کے اعتبار سے نہ تعاقب ہے اور نہ تسلسل۔ اِس کا ظہور گویا خود اشیاء کا ظہور ہے۔ اور ساتھ ساتھ متعارف زمانے کا بھی۔ یہ خود تاثیر اور تخلیق ہے[1]

اصل وقت از گردش خورشید نیست وقت جاوید است و خور جاوید نیست

زندگی از دہر و دہر از زندگی است "لاتسبوا الدہر" فرمان نبی است

ابن عربی کے نزدیک زمانے کی اس دوسری حیثیت کا مدار باری تعالیٰ کی شان پر ہے۔ باری تعالیٰ کی شئون غیر محدود ہیں جو مسلسل پھیلتی رہتی ہیں۔ اِس آن اُس کی ایک شان ہے اور دوسری آن میں دوسری شان۔ گویا ایک شان سے دوسری شان میں تبدیلی اتنی تیز ہوتی ہے کہ اُس کی حقیقی تعبیر ممکن نہیں۔ افہام و تفہیم کی سہولت کے لئے

---

[1] مقدمہ ۲۱، ص ۲۵ خطبات ص ۶۳، ص ۶۸، ص ۷۴، ص ۷۷، ص ۷۸، ص ۷۹، ص ۸۱، ص ۹۰، ص ۱۰۶، ص ۱۰۹

اُس کو لمح بصر (پلک کی جھپک) یا آن سے تعبیر کیا جاتا ہے' ابنِ عربی قائل ہیں کہ باری تعالیٰ کی ہر شان فعل اور تاثیر ہے جس سے ممکنات کا اپنی استعدادوں کے مطابق ظہور ہوتا ہے - چونکہ ممکنات کی استعدادیں مختلف ہیں اس لئے خارجی عالم میں اُس کی اِس شانِ کن فیکون کا ظہور شمسی ایام کے پیمانے پر مختلف ہوتا ہے - چنانچہ باری تعالیٰ کی یہ شان اور "کن" جو اپنی اندرونی حیثیت میں لمح بصر یا آن سے زائد نہیں خارجی عالم میں ہزار دن سال تک ممتد ہو سکتی ہے - مگر اُس کی یہ وسعت اور امتداد تاثیر اور تخلیق کے اعتبار سے نہیں ہے کیونکہ اِس اعتبار سے تو وہ آنی ہے - بلکہ اُس کی یہ وسعت اور امتداد اثر اور مخلوق کے اعتبار سے ہے - جس میں خود ممکن یا اثر کی استعداد کو دخل ہے[1]

وحدتِ وجود ابنِ عربی تو نہ صرف یہ کہ وحدت وجود کے سرگرم حامی ہیں بلکہ بعض علماء کا تو خیال ہے کہ وہ مسلمانوں میں سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اِس خیال کو پیش کیا اور کم از کم یہ تو ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اُنہوں نے مسلمانوں میں سب سے پہلے اِس خیال کو پھیلا کر ایک نظام کی صورت میں مرتب کیا - اِقبال کے اگر تمام مابعد الطبعیاتی خیالات پر ایک مجموعی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی وجود کی وحدت کے قائل ہیں - لیکن تاہم وحدت وجود کے دونوں تصوروں میں کافی اختلاف ہے -

اِقبال کے نزدیک موجودات کی اصل ایک متعین اور بسیط وحدت ہے جو غیر محدود فعلی اور تخلیقی صلاحیتوں کی حامل ہے - یہ وحدت روحانی نوعیت کی لافانی حیات ہے - علم ارادہ اور مقصدیت اِس میں باہم دیگر اِس طرح پیوست ہیں کہ ایک کی حقیقت دوسرے کے بغیر ممکن نہیں - اظہارِ ذات اِس وحدانی حقیقت کا ذاتی تقاضہ ہے - یہ تقاضا علم و ارادے کے تحت ہے - اِظہارِ ذات کے معنی ہی یہ ہیں کہ اُس کی فعلی اور تخلیقی صلاحیتیں بروئے کار آجائیں - چنانچہ ہمیشہ سے ذات اپنی ذات کے اِس تقاضے کو پورا کر رہی ہے - اِس کے ظاہر ہونے کے معنی ہیں اُن اشیاء یا افعال کا مسلسل تدریجی ظہور جو بسیط کیفیتوں کی صورت میں ذات کے بطن میں پوشیدہ ہیں - اِن افعال اور اشیاء کے بقدر استعداد یکے بعد دیگرے ظہور سے مکانی اور زمانی نسبتیں متعین ہوتی ہیں - چونکہ اقبال کے نزدیک وجود کی اصل اور اُس کا جوہر حرکت ہے لہذا یہ اشیاء اور افعال بھی حرکتیں ہیں - گویا ہستی حرکت کا ٹھاٹیں مارتا ہوا

---

[1] فتوحات جزء اول ص ۲۳۵ جزء چہارم ص ۴۲۵ ایضاً جزء اول ص ۲۳۵ -

ایک بے پایاں سمندر ہے۔ جو ہمیشہ سے ہمیشہ تک کے لئے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اس سے اور اُس میں چیزیں صورت پذیر ہو رہی ہیں۔

چو موج از بحر خود بالیدہ اَم من   بخود مثل گہر پیچیدہ اَم من

یہ مسلسل اور مستمر وجودی حرکت اپنے باطن اور اندرون کے اعتبار سے واحد ہے مگر ظاہری اور بیرونی رُخ کے اعتبار سے ساکن اور جامد شخصیتوں کے مجموعے ہیں۔

خود شکن گردید و اجزا آفرید   اندکے آشفت و صحرا آفرید

گویا شخصیتیں اُس ذاتِ واحدہ کے خاص خاص افعال یا خاص خاص صورتیں ہیں۔ مرکزِ حرکت اور منبعِ حیات سے جو ایک نکاتی نقطہ ہے گوناگوں حرکتیں آگے بڑھتی ہیں اور پھیلتی جاتی ہیں۔ ان کی باہم دگر تالیف اور ترکیب سے اشیاء ظاہر ہوتی ہیں اور یہی اُس ذاتِ واحدہ کا ظہور ہے۔[۹۱]

باش تا عُریاں شود ایں کائنات   شوید از دامانِ خود گردِ جہات

در وجودِ او نہ کم بین و بیش   خویش را بینی ازو او را ز خویش

ابن عربی اُس ذاتِ واحدہ کو جو اُن کے نزدیک کل موجودات کی اصل ہے مبہم عام اور بے تعین تسلیم کرتے ہیں۔ ذات کے ظہور کے لئے اُس کا متعین ہونا ضروری ہے۔ تعینات اور تشخصات کا اعتبار کئے بغیر کسی مطلق اور عام ذات کا ظہور ممکن نہیں۔ کائنات اُس ذات کے تعینات کا نام ہے۔ اِن تعینات کی اپنی کوئی مستقل ہستی نہیں۔ ان کی ہستی کے معنی بس یہ ہیں کہ ذات ایک خاص نوعیت کی ہستی رکھتی ہے یعنی اس کا وجود ایسی نوعیت کا ہے کہ اُس سے اُن تعینات اور خصوصیات کا استخراج اور استنباط کیا جا سکتا ہے۔ اگر ذات سے قطعِ نظر کر لی جائے تو جہاں تک اُن تعینات اور تشخصات کا تعلق ہے وہ کوئی ہستی نہیں رکھتے۔ وہ نقطہ ذات کی ہستی کا پرتو ہیں۔[۹۲]

---

[۹۱] مقدمہ ص۱۴ خطبات ص۵۲ ص۷۵ ص۷۶ ص۷۷ ص۸۰ ص۸۱ ص۸۲ ص۸۷ ص۹۰ ص۹۳ ص۹۵ ص۹۹ ص۱۰۷ ص۱۰۹ ص۳۴۷ ص۲۰۷

[۹۲] فتوحات جزء اول ص۱۳۱ ص۱۸۱ ص۱۸۲ جزء دوم ص۵۱۴ ص۳۰۹ ص۳۱۲ کتاب الاجوبہ سوال ۵۸، ۶۵، رسالہ مراتب وجود، فصوص کلمہ طیبیہ، کلمہ شعیبیہ، کلمہ ابناسیہ، کلمۃ الالیاسیہ، کتاب الفصوص۔ نص اول۔

اقبال اور ابن عربی کے مذکورہ صدر خیالات پر اگر گہری نظر ڈالی جائے اور اُن کے مشترک اور ممتاز نقطوں کا تجزیہ و تحلیل کی جائے تو واضح ہو جائے گا کہ بعض نظریے مثلاً کائنات کی تبدیلیوں کا ارتقائی ہونا یا دینوی، برزخی اور اُخروی حیات کی توجیہیں، اُن میں محض اجمال اور تفصیل کا فرق ہے۔ ابن عربی کے یہاں جو خیال مجمل اور غیر مشرح ہے اقبال کے یہاں اُس کی توضیح اور تشریح ہے لیکن جہاں دونوں کے افکار میں کوئی حقیقی فرق ہے تو اُس کا تعلق حقیقۃً زیرِ نظر تصورات کے بجائے دونوں نظاموں کی اصولی اور اساسی خصوصیتوں سے ہے۔ بلکہ دونوں کے افکار کے بنیادی اختلاف کا ہی نتیجہ ہے مثلاً کائنات کے تغیر و تبدل کی نوعیت دونوں کے یہاں الگ الگ ہے۔ اقبال کائنات میں تکرار اور اعادے کو ممکن نہیں جانتے مگر ابن عربی کے نزدیک زیادہ سے زیادہ تکرار اور اعادے کا وقوع نہیں۔ ابن عربی کے نزدیک ہر شئے جہاں تک اُس کی ذات اور حقیقت کا تعلق ہے قدیم ہے کیونکہ ممکنات کی حقیقت اور ذات خود باری تعالیٰ کی ذات ہے۔ محض اُس کی شخصیت اور تعین حیثیت یا صورت حادث ہے۔ اقبال کے نزدیک اشیاء اپنے مستمر سلسلے اور دائمی روانی سے الگ ہو کر اپنی منفصل حیثیت میں کامل پر طور پر حادث ہیں۔ اقبال کے نزدیک کائنات آزاد ہے اور ابن عربی کے نزدیک مجبور۔ حقیقی زمانے کے دونوں تصور جدا جدا ہیں۔ وحدت وجود کے دونوں قائل ہیں۔ مگر دونوں کے تصوروں میں کافی فرق ہے۔

حرکت کو کائنات کی اصل مانکر جیسا کہ اقبال کا خیال ہے نہ تو اعادہ اور تکرار کو ممکن کہنا صحیح ہے اور نہ تغیر و تبدل کو محض صورتوں تک محدود کرنا۔ اسیطرح کائنات کو ایک متعین اور مستمر وحدانی حقیقت تسلیم کر لینے کے بعد وحدانی سلسلے کے بجائے الگ الگ شخصیتوں کے محسوس ہونے کی توجیہ یہ فرض کئے بغیر ممکن نہیں کہ انسانی عقل و فکر کی خاصیت یہ ہے کہ وہ مستمر حرکت اور سیلان کو پارہ پارہ کر کے اور پھر اُن کو جامد اور قائم بنا کر ہی گرفت کر سکتی ہے۔ اور اس توجیہ کے تحت اشیاء کے حدوث کی تشریح وہی ہو سکتی ہے جو اقبال نے کی۔ چونکہ اقبال اس مستمر تخلیقی حرکت کو آزاد تسلیم کرتے ہیں اس لئے شخصیت یا خودی کو بھی آزاد اور مختار کہنا پڑتا ہے لیکن ابن عربی کی تشریح وجود کی بناء پر کسی چیز کا بھی آزاد اور مختار ہونا ممکن نہیں۔

زمانے کے حقیقی مفہوم کے تعین میں جو فرق ہے اُس کو اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ بھی ذات اور اُس کے افعال کی نوعیت میں اختلاف کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ ابن عربی اور اقبال دونوں نے حقیقی زمانے کا معیار

باری تعالیٰ کے فعل اور اُس کی شان کو ہی قرار دیا ہے لیکن ابن عربی کی تشریح کے اعتبار سے اس کا فعل یا اُس کی شان ایک آنی حقیقت ہے لیکن اقبال کی تشریح کو دیکھتے ہوئے باری تعالیٰ کا فعل ایک نہ قطع ہونے والی تخلیقی حرکت ہے۔ یہی فعل اقبال کے نزدیک حقیقی زمانے کا معیار ہے۔ لہذا جس طرح فعل ایک مستمر اور آگے کو بڑھتی ہوئی حرکت ہے اُسی طرح زمانہ بھی ایک مستمر اور آگے کو بڑھتی ہوئی شئے ہے۔ ذات اندرونی حیثیت میں ایک بسیط عضوی وحدت ہے جس میں اس کے تمام افعال مجملاً موجود ہیں۔ لہذا اُن افعال کے مطابق ہی ذات کا اندرونی زمانہ ہے جو ذات میں ایک بسیط یا آنی حیثیت میں موجود ہے۔

اقبال اور ابن عربی دونوں وجود اور ہستی کو وحدانی حقیقت تسلیم کرتے ہیں لیکن اِس وحدانی حقیقت کی تشریحیں اور اُس کی خصوصیات دونوں کے نزدیک اصولی طور پر ایک دوسرے سے ممتاز ہیں لہذا اقبال کی وحدت وجود کی تشریح کا ابن عربی کی تشریح سے مختلف ہونا بھی ضروری ہے۔

خلاصہ یہ کہ ابن عربی اور اقبال کے خیالات میں جو حقیقی فرق ہے وہ اُن کے اصولی اختلاف کا ضروری نتیجہ ہے۔ جہاں تک دونوں کی توجیہوں اور تشریحوں کے ماخذ کا تعلق ہے دونوں عقل و وجدان کی نہایت نازک اور دقیق تجلیوں پر مبنی ہیں۔ ہر نظام اپنے عہد کے تصورات اور خیالات کا عکس ہے۔ اقبال کے افکار موجودہ عہد کی عقلیت کی نمائندگی کر رہے ہیں اور ابن عربی کے تصورات اُن کے عہد کی عقلیت کی، اصل حقیقت کیا ہے غالباً ہر عقلی موشگافی سے برتر اور ہر منطقی نظم و استدلال سے بلند۔

نے عقل بغایت جلال تو رسد　　نے فکر بکنہ لایزال تو رسد
در کنہ کمالت نرسد ہیچ کسے　　کو غیر تو، تا کنہ کمال تو رسد

محمد عبد السلام

فلسفۂ اقبال کے بعض مسائل

تمہید

اِقبال کے ہاں مذہب، فکر اور فن تینوں کا بڑا اچھا امتزاج ملتا ہے یہ فلسفہ کا کمال بھی ہے اور اُس کا زوال بھی - مذہب فلسفہ اور سائنس ایک دُوسرے کے نقیض اِس قدر رہیں جس قدر کہ نہیں بھی - زندگی کا تضاد در تناقض اس کا آہنگ ہے - افکارِ انسانی بہت حد تک جبلی سرچشموں سے سیراب ہوتے ہیں - عقلی استدلال کتنا ہی خارجی کیوں نہ ہو آرزوؤں کی پرچھائیں اُس پر پڑ ہی جاتی ہے - لیکن یہ حقیقت کے معروض نہ ہونے کی دلیل نہیں - اقبال کے فلسفہ کا مبالغہ اُسی حقیقت کو نظرانداز کرنے کا بلاواسطہ نتیجہ ہے - اس چھوٹے سے مضمون کا مقصد اس وقت اقبال کے فلسفہ کی تنقید نہیں بلکہ اس کے بعض مسائل کو خالص اکادمی فلسفہ کے نقطۂ نظر سے اُلٹ پلٹ کر دیکھنا ہے - ضمناً ان کے مابعدالطبیعاتی تصورات کے حکیمانہ انداز کی طرف اشارہ بھی کرنا ہے - لیکن یاد رکھئے، اقبال کے فلسفہ کی کوئی تنقید اس کے فن کے جادو کو کم نہیں کر سکتی - وہ ایک عظیم المرتبت آرٹ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جو بلند ہے، اِتنا بلند ہے جس پر تنقید کی کوئی کمند نہیں ڈالی جا سکتی -

خودی اقبال کا فلسفہ خودی کا فلسفہ ہے - فلسفہ میں ان کا طریق وجدانی ہے - انہیں بنیادی الہیاتی عناصر سے ان کے اِجتماعی فلسفے کے تانے بانے تیار ہوتے ہیں - خودی کا فلسفہ ہونے کی حیثیت سے یہ اِثبات حیات کا فلسفہ ہے - کانٹ کے تصورات کے جس حصہ پر زور دیکر شوپنہار نے اُپنے منفی فلسفہ کی تشکیل کی تھی - نٹشے نے اِسی پر ایک مثبت فلسفہ کا ڈول ڈالا - اِقبال نے یورپ کی اِس چنگاری کو نہ صرف مفید مطلب سمجھا بلکہ اپنی فطرت کے عین مطابق بھی - پیچھے نظر دوڑائی تو اسلام جیسے غیر الہیاتی لیکن اخلاقی مذہب میں اس کا جواز پایا - اِس سے آج کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اِقبال اِسلام تک ایک دُور دراز رستے سے پہونچے ہیں -

حزبِ کلیمی کے ظہور کے لئے طلسمِ سامری کا وجود ضروری ہے - ایک غلام قوم کے فرد ہونے کی حیثیت سے اقبال کا ذہن اس فلسفے کے لئے جبلّی طور پر تیار کیا گیا تھا - وہ شدید احساسِ قوت، جسے اقبال نے بعد کو جلالی کیفیتوں سے موسوم کیا ہے - دراصل اپنی اجتماعی بے بسی کا ایک زبردست انفرادی ذہن کے اندر ایک زبردست ردِ عمل تھا - یہ ردّعمل براہِ راست اس جمود و بے حسی کی پیداوار تھا جسے اقبال نے ہمارے زوال کا واحد سبب مانا ہے - لیکن یہاں اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں نہ بند کرنا چاہئیں کہ ردّعمل اپنے اندر تصادم کی ساری قوتیں رکھتے ہوئے بھی حیات کا متوازن نقطہ نظر نہیں - خودی کے تصور میں اقبال کا غلو، جس کے باعث کہ وہ فرد اور جماعت کے تعلقات کو باوجود کوشش کے ہم آہنگ نہ کر سکے - اسی مجبوری کا عکس ہے -

جدید نفسیات کے نقطۂ نظر سے اقبال نے انسانی جبلت کے صرف ایک پہلو کو حقیقت مان کر اس پر اپنی الہیات کی تشکیل کی ہے - تحفظِ خودی جبلت جبلّی نفسیات کی سب سے بڑی حقیقت سہی لیکن واحد حقیقت نہیں - شعلۂ حیات کے استحکام کے لئے منفی اور مثبت رو میں کچھ اسطرح چلتی ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ تصور نہیں کیا جا سکتا - انسانی سیرت کی ساخت و پرداخت میں نفی اور اثبات، خودی اور بے خودی، خارجیت اور داخلیت، لطافت اور کثافت کچھ اس طرح گھلے ملے ہیں کہ کسی کو حقیقت کلی نہیں مانا جا سکتا - مہاتما گوتم بدھ کی تعلیمات کا مبالغہ (جن کا طریقِ معرفت ذہن میں رکھئے گیان تھا) کچھ اسیطرح کی یکطرفہ شہادت تھی - اقبال کا اثباتِ حیات کا فلسفہ (جس کا طریق وجدان ہے) اس اعتبار سے کچھ ایسی ہی ڈھلک لئے ہوئے ہے گوتم نے بھی من ہی میں ڈوب کر حقیقت کا عرفان کیا تھا - اقبال بھی من ہی میں ڈوب کر اپنے طرزِ زندگی کا سراغ لگاتے ہیں - آخر یہ تفاوت کیوں ؟ حقیقت یہ ہے کہ من میں ڈوب کر انسان نکھر سکتا ہے، بدل نہیں سکتا - اور ایسا کہتے وقت نفسیات کے جدید انکشافات میرے ذہن میں ہیں -

اقبال کا تصورِ خودی، مجھے ڈر ہے کسی دن کوئی شوریدہ پشت ماہرِ نفسیات ضرور کہہ اٹھے گا، ایک مخصوص جبلت کا آسیب ہے - اس صدی کے شروع میں فرائڈ نے اسی سے ملتا جلتا ایک جنسی آسیب کھڑا کیا تھا - لیکن جدید نفسیات نے اس مبالغہ کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے - یہ حقیقت بھی ہے کہ انفرادی اور خاص طور سے اجتماعی فلسفہ کی تنظیم نہ تو جنس پر ہو سکتی ہے اور نہ بھوک پر، نہ یہ ہوسِ قوت پر ہو سکتی ہے اور نہ سوزِ آرزو پر - اس قسم کے باطنی تجربات

فرد کی زندگی کو ممکن ہے نئے سرے سے غسل دے سکیں لیکن اُن کی تعمیم کرنا ذہنِ انسانی کی وحدت کو جھٹلانا ہوگا۔ رہی شاعرانہ آب و رنگ کی بات تو وہ دونوں کو عطا کیا جا سکتا ہے۔ اگر تحفظِ خودی کا سلسلہ پرحول انّ فی " انا " "میں" یا "خود" سے ملایا جا سکتا ہے تو جنسِ بھی تخلیق کی ساری پُر اسرار عظمتوں کی حامل کہی جا سکتی ہے۔

اقبالؔ کے فلسفۂ خودی کے نفسیاتی مفہوم کی توضیح کی جائے تو اُن کے ذہن کے بعض تنگ و تاریک گوشوں پر بھی روشنی پڑے گی۔ لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کونسا راستہ صحیح ہے؟ نفسیات سے الہیات یا الہیات سے نفسیات کی طرف؟ جو بھی ہو" طلسم بود و عدم" کے الہیاتی کا جواز جدید نفسیات میں ڈھونڈنا میرا مقصود بھی نہیں میں تو اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ چنانچہ کوئی الہیاتی نظام اس وقت تشکیل نہیں پا سکتا جب تک اس کا بنانے والے رائج الوقت سائنٹفک معلومات سے پورا پورا فائدہ نہ اُٹھائے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے انسان کی تعمیر میں منفی و مثبت دونوں رویّں غالب کی زبان میں تعمیر و تخریب دونوں صورتیں مضمر ہوتی ہیں۔۔ اس کا غم اس کا ذوقِ فنا اور اس کی مرگ آرزو اتنی ہی حقیقی ہے جتنی کہ اُس کی خود نمائی اور تخلیق آرزو۔ ثبات کا تصور صرف ایک منفی پس منظر کے ساتھ سمجھ میں آ سکتا ہے۔ حیات و ممات دو پہلو رکھنے والی ایک حقیقت ہے۔ شوپنہار کے فلسفہ کی سب سے بڑی خامی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اپنی منفی تصورِ حیات کی سیرابی وجدان سے کرتا ہے' اقبالؔ خودی اور زندگی کے گوہر کیا کو اِسی وجدان سے حاصل کرتے ہیں۔ گویا وجدان کے لئے بھی ایک مثبت مفروضہ ضروری ہے۔

اقبالؔ کے فلسفیانہ خیالات کی یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ جس طرح اُن کی ابتدا نہیں معلوم اُن کی اِنتہا بھی تاریکیوں میں کھو جاتی ہے۔ وہ بہ یک وقت جدید بھی ہیں اور قدیم بھی۔ ایک طرف سے وہ اپنا سلسلۂ فکر ارتقائی مفکروں سے ملاتے ہیں اور دوسری طرف اُن کا طریق فکر متکلمانہ بھی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے افکار میں ارتقائی نظریۂ حیات کا پورا حل نہ پیش کر سکے۔ حیات کی تکمیل کس رنگ سے ہوگی؟ کس مقام پر ہوگی؟ کیا کائنات بھی مکمل ہو جائے گی؟ اگر ہو جائے گی تو کیا اس طرح یہ ارتقائی فلسفہ کا بطلان نہیں بن جاتی۔ اِس لئے صرف دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو ارتقا کو ایک خاص مقام پر ختم کر دیں ورنہ پھر حقیقتِ کلی کے ارتقا کو بھی تسلیم کریں۔ دونوں طریقوں سے واحدیت پرستوں کے لئے دقتوں کا سامنا ہے۔ اقبالؔ برگسان کی طرح اس کا کوئی حل پیش نہ کر سکے۔

اِن مابعد الطبیعاتی اور مذہبی تصورات کے تضاد سے قطع نظر اقبالؔ کے فلسفہ کے جو اخلاقی اور حیاتیاتی

نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ بھی تشفی بخش نہیں - حیات انسانی کا جو شاہینی تصور پیش کیا ہے وہ باوجود کوشش کے ایک شاہانہ اخلاق کی تخلیق کرتا ہے - جو اخلاق الٰہی سے یقیناً مختلف ہے - جو اصول بن سکتا ہے، ذوق نہیں - جو عرقِ محبت سے نہیں خون سے سیراب ہوتا ہے - جہاں ذہن کی تلخی ہے احساس کی مٹھاس نہیں - جمالیات کی روح لطیف اس سے گدلی ہو جاتی ہے - کیونکہ یہاں حلول باشعور نہیں ملتا - استعاروں کے پردوں میں اگر مفہوم چھپا جا رہا ہو تو یوں سمجھئے کہ اقبال کا حسن مجرد کا تصور نہایت محدود ہے، جو زندگی پر عکس ریز نہیں ہوتا سایہ بن کر چھا جاتا ہے - چنانچہ یہاں اسطرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ اس نظریئے کے تحت اقبال نے جس نغمہ کی تخلیق کی ہے وہ نغمہ کے صحیح مفہوم کو ادا نہیں کرتا - یہ نشتر زنی کرتا ہے مرہم کا کام نہیں دیتا - یہ اعصاب کو مشتعل کرتا ہے، تسکین نہیں دیتا - یہ ریشہائے زندگی کی افزائش نہیں کرتا انھیں جلا دیتا ہے -

وجدان | اقبال اپنی الٰہیات میں طریق کے اعتبار سے پرانے بھی ہیں اور نئے بھی - زندگی پر جو سیاہ غلاف چڑھے ہوئے ہیں، جب تک وہ ایک ایک کرکے نہ اتار دیئے جائیں علم باطنی اور اس کے ساتھ وجدان کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل رہے گی - اور شاید مذہب ظلمات کے انہیں سرچشموں سے دوام حاصل کرتا رہے گا -

وجدان مشرقی مفکرین کے لئے نیا انکشاف نہیں - مشاہدہ ذات کے اس طریق پر رومی نے جتنا زور دیا ہے اس کی نظیر کسی مفکر کے یہاں نہیں ملتی - زندگی کے تضاد اس کی ثنویت اس کی داخلیت اور خارجیت کو اسی کے ذریعہ سے ہموار کیا جا سکتا ہے - کانٹ کے بعد سے مغرب میں بھی فلسفہ کا عام رجحان اسی طرف ہوتا گیا ہے - حتیٰ کہ برگساں کے یہاں یہ ایک مستقل جگہ حاصل کر لیتا ہے - اقبال کے خیال میں اسلام کی سچی روح تجربی ہے علم کے لئے تجربہ ضروری ہے - لیکن جدید سائنس نے اس سلسلے میں بھی غلو برتا ہے - اقبال اس کے ڈانڈے وجدان سے ملا دیتے ہیں - وجدان ہی کے ذریعہ وہ خودی اور خدا دونوں کا عرفان حاصل کرتے ہیں - ان کے خیال میں وجدان بھی ایک قسم کا تجربہ ہے لیکن ایک نادر اور نایاب تجربہ!! چنانچہ اقبال مادہ پرستی کے خلاف ہیں لیکن فطرت کے معروضی وجود کے منکر نہیں - ذہنی تصورات پر زور دیتے ہیں لیکن برکلے کے برعکس تصوریت کے مسلک

سے اِختلاف کرتے ہیں اور حقیقت کو ذہن کا کرشمہ نہیں بتاتے ۔ وہ دراصل ذہنِ اِنسانی اور کائنات میں آہنگ پیدا کرنا چاہتے ہیں ۔ اسی کی خاطر اُنہوں نے عالمِ خارجی کا اِثبات چاہا ہے ۔ اِسی آہنگ کی خاطر وہ خدا کے وجود کو بیچ میں لائے ہیں جو خبر نہیں کہ جامد ہے یا ترقی پذیر ۔

وجدان کی حقیقت سے آج کون اِنکار کر سکتا ہے ۔ لیکن خالص الٰہیاتی نقطۂ نظر سے یہ ایک قسم کا اِنسانی عجز ہے ۔ پھر اقبال کا وجدان بہت زیادہ داخلی رنگ لئے ہوئے ہے ۔ اسطرح اس کا رشتہ تحت الشعور سے ملایا جا سکتا ہے ۔ دوسرے اہلِ باطن اور اقبال کے یہاں صرف استعارہ کا فرق پایا جاتا ہے ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اِس نادر تجربہ کے اظہار کے لئے زبان کا جو استعارہ صوفی استعمال کرتا ہے وہ کسی حد تک دبی ہوئی جنسی خواہشات کا آئینہ ہوتا ہے ۔ تصوف کی پُر پیچ راہوں میں داخل ہونے سے پہلے جسم اور نفس کو جن کڑی ریاضتوں سے گذرنا پڑتا ہے وہ اس بات کے شاہد ہیں ۔ اِس قسم کے صوفی کی مختصر تاریخ کیا ہے ؟ جسمانی کمزوری فطری یا خود ساختہ ۔ فاقے، نقاہت ! اوائل عمر میں اخلاقی کمزوریوں کا شکار ! اسطرح اخلاق کا یہ زندہ کھنڈر اگر ابدی وصل یا بطنِ مادر میں لوٹ جانے کی خواہش نہ کرے تو کیا کرے ۔ منطق کچھ اِس طرح کی ہوتی ہے ۔ فتح و شکست کیا ہے : اضافی : دُنیا : علم : محبت کیا ہیں سب بے ثبات سب بے ثبات !! کیا اِن کی خاطر میں اپنے فنا کی ابدی لذتوں، اپنے مٹنے کے دائمی حق کو تج دوں : نہیں ! اور یہ سوچتا سوچتا فنا کا یہ زندہ نقش پھر اپنی سمادی بلندیوں میں کھو جاتا ہے ۔ اقبال نے اپنے وجدان کے ذریعے جو کچھ پایا ہے وہ بھی ایک مہیب آسیب سے کم حقیقت نہیں رکھتا ۔ جس کی وجہ سے ان کی الٰہیات مذہب کے بھبکے میں تبدیل ہو جاتی ہے ،

اسلام ایک خارجی مذہب ہے ۔ اس میں انفس و آفاق دونوں حقیقی ہیں ۔ اِس میں "غیب" پر ایمان ہے لیکن "حضور" کی حقیقت کا اعتراف بھی ہے ۔ خارجی مذاہب میں چونکہ حکمت نظری کے مقابلہ میں حکمتِ عملی پر زور ہوتا ہے اِس لئے عام طور پر وہ اخلاقی ہوتے ہیں ۔ جس میں الٰہیاتی مفکر کے لئے کوئی گنجائش نہیں ۔ داخلی مذاہب عام طور پر ایک خاص قسم کے تصوف پر ختم ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اخلاقیات کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں ۔ اقبال نے ایک قسم کے تصوف سے پناہ مانگی ہے ۔ لیکن دوسرے میں لی ہے ۔ اِسلام کی تعلیمات کو سمجھنے

والے اور اُس کی سچی رُوح کے علمبردار اقبال کی اِس نئی ترجمانی اسلام کو شاید کبھی بھی معاف نہ کریں گے۔ اقبال نے جدید عقلی علوم کی بنیاد پر ایک جدید علم الکلام اور ایک نئے مابعد الطبیعاتی نظام کی عمارت کھڑی کی، بلکہ یوں کہئے سائنس اور فلسفے کے جدید تصورات سے اسلام کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ جس کے لئے اُنہیں تصوف کی بھی نئے سرے سے تعریف کرنا پڑی۔ وہ فلسفہ کے منکر بھی رہے لیکن اپنے تصورِ حیات کی تفسیر کے لئے اِس راندۂ درگاہ کو آلۂ کار بھی بنایا۔

اَب اِقبال کے وجدان اور اُن کے نئے تصوف کے اخلاقی اور مذہبی مفہوم پر بھی غور کر لیجئے۔ اِن کا "فاتح عالم خوب و زشت" ارتقا کے جب آخری مدارج طے کر لیتا ہے تو اُس کو پھر کسی بندھے ٹکے مذہب یا وساطت کی ضرورت نہیں رہتی۔ اِس طرح اُن کے عقاید کا شیشہ ان کی منطق سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ مذہب اجتماعی ضرورت کو پورا کرتا ہے یا انفرادی ضرورت کو، ایک فرد کا دوسرے فرد سے کیا رشتہ ہے، کیا فرد کا عرفان ایک ہمہ گیر اِجتماعی عرفان بن سکتا ہے۔ اِس قسم کے سوالات قایم کیجئے تو فلسفی شاعر کے افکار کا تضاد روشن ہو جائے گا۔ دراصل اخلاقیات کے تانے بانے ہماری اِجتماعی زندگی سے گتھے ہوئے ہیں۔ اِس لئے ہم بعض خالص خارجی اصولوں کو نظر انداز کر کے داخلی قدروں کو فروغ نہیں دے سکتے۔ کم از کم اسلامی اخلاقیات اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ خود اقبال نے اِس حقیقت کو آخر میں پا لیا تھا۔ وارڈ کی رہبری میں وہ عقل اور وجدان کے صحیح رشتہ کو بھی سمجھ گئے تھے جس کی حقیقت ایک مکمل دائرہ کی سی ہے جس کا ایک حصہ روشن ہے اور دوسرا تاریک۔ جس طرح روشنی حصے کی امامت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ظلمات کے امکانات سے بھی کون انکار کر سکتا ہے۔ وہی تجربات، چاہے وہ کسی نوعیت کے ہوں ایک تسلسل میں وارد ہوتے ہیں۔ عقل اور وجدان دونوں ایک دوسرے کے اندر سے ہو کر گذرتے ہیں۔ اِسطرح دونوں ایک دوسرے کی ابتدا بھی ہیں اور انتہا بھی۔ اِقبال اگر اِس متوازن تصور کو ذہن میں رکھ کر اپنے افکار کی تعبیر کرتے تو وہ فرد کے وجدان کو اتنی زیادہ اہمیت نہ دیتے جسقدر کہ اُنہوں نے دی ہے۔ یہ نادر تجربہ اتنا ذاتی اور نجی ہوتا ہے کہ اِس کی اجتماعی حیثیت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے نتائج مرتب کرنا نہایت دشوار ہے۔ البتہ مابعد کے اثرات سے اس کا تھوڑا سا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پرانے تصوف کا

یہ ایک مانا ہوا اصول ہے کہ مشاہدہ ذات کے بعد صوفی نہا کر نکلتا ہے - اِس رُوحانی غسل کے بعد اِس میں آفاقیت آجاتی ہے - بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ زندگی میں انسانی نقطۂ نظر پیدا ہوجاتا ہے - صوفی کی شخصیت میں غیر معمولی جاذبیت اور کشش اِسی وجہ سے پیدا ہوجاتی ہے - آئیے دیکھیں کہ اقبال من میں ڈوب کر کیسے نکلے ؟ اِن کا خیال تھا کہ انھیں خدا کا تو نہیں لیکن خودی کا عرفان حاصل ہو گیا تھا - پھر یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ وہ حکمت عملی کو اصل فلسفہ مانتے تھے - اَب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو پہچاننے والے کے لئے اقبال نے اپنے افکار میں حسبِ عظمت یا بلندی کی طرف اشارہ کیا ہے - اِس بندۂ مولا صفات کی ذات سے کہاں تک عیاں ہے - اِس کی تفصیل فراہم کرنا تو ان کے سیرت نگار کا کام ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ کمی ضرور تھی - جس کا اِحساس خود اس "مردِ جلیل و جمیل" کو بھی تھا -

اجتماعی فلسفہ | اِقبال کی متکلمانہ عصبیت کا اظہار ان کی الٰہیات سے کہیں زیادہ ان کے فلسفۂ اجتماعی میں ہوتا ہے - اَپنے اُستاد داغ کے متعلق جو اُنھوں نے کہا ہے ؎

آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

دُوسرے معنوں میں خود اُنکے اجتماعی فلسفہ پر یہ صادق آتا ہے - ہر فلسفی کا نظریہ اجتماعیات اِس کے مابعد الطبیعاتی تصورات کے تحت مرتب ہوتا ہے - اِس طرح اِس کے افکار میں وحدت آتی ہے جو فلسفہ کا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے - لیکن اقبال نے کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے' اَپنی زمین پر اَپنے آسمان کی تعمیر کی - پھر یہ عجیب بات ہے کہ وہ ہیئت اجتماعیہ کی بنیاد عقلی اور خارجی قوانین پر رکھتے ہیں حالانکہ اُن کے الٰہیات کی بنیاد خالصتہً انفرادی وجدان پر ہے - وقت یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ اُنھوں نے اشتراکیت کے اصولوں کا ہمدردی کے ساتھ کس حد تک مطالعہ کیا تھا - ایک بات ضرور ہے وہ اِس سے گھبراتے نظر آتے ہیں - ورنہ اِس کی طرف اُن کا وہ ردیہ نہ ہوتا جس کا اظہار اُن کے آخری دور کے کلام سے ہوتا ہے - اَپنی شاعری میں اُنھوں نے ہر جگہ اسے ایک منفی تحریک سے تعبیر کیا ہے بڑے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس صاحب نظر نے مادہ پرستی پر ٹکے ہوئے اِس نظام کے انسانی نقطۂ نظر کو بھی

تسلیم نہیں کیا - وہ یہ بالکل فراموش کر جاتے ہیں کہ اِس نے انسان کو معاشی نجات دے کر اُس کی شخصیت کا احترام کیا ہے اور کروایا ہے - رہی عالم بالا کی بات، تو ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے گو مانتے کم ہیں - کہ معاشی نجات کے جلو ہی میں تمام روحانی نجاتیں آجاتی ہیں - عالم امثال کی بنیاد یہی مایا جنجال ہے، ورنہ وہ خام خیالی ہے - جس مذہبی احساس کی اقبال کو اِس میں کمی نظر آئی ہے کیا اُسے انسانیت کے گہرے احساس سے پُر نہیں کیا جا سکتا ؟ کیا مشیت کے اُن نئے اصولوں کی تہ میں سماجی انصاف کا بلند ترین تصور نہیں ملتا ؟ کیا بالذات انسانیت زندگی کی سب سے بڑی قدر نہیں ؟ اِقبال خود اس کو تسلیم کریں گے لیکن بڑھیا کا ٹیکا کچھ اور ہی تھا !! اس کا ذکر میں ایک دفعہ کر چکا ہوں دوبارہ نہ کروں گا -

مسعود حسین خان

اکبر اور اقبال

کمال اور زوال، بلندی و پستی، سرفرازی اور تنزلی، ان الفاظ میں دنیا کی تاریخ دہرائی جا سکتی ہے ہندوستان مغلوں کے زمانے میں اپنے عروج کا شباب دیکھ چکا تھا، شاہجہاں کے عہد میں پردیسیوں کی نظر بد اس شباب کو گھن بن کر لگ گئی اور یہ جلد از جلد شیب میں تبدیل ہوتا چلا گیا تا آنکہ ۱۸۵۷ء کا حادثہ رونما ہوا ۱۸۵۷ء میں سلطنتِ مغلیہ نے ایک سنبھالا لینے کے بعد ہمیشہ کے لئے دم توڑ دیا اور وہ بابری شمع جو اس بزم رنگیں کو تین سو سال تک

چلا دیتی رہی جھلملا کے ختم ہو گئی اور اپنے ساتھ پرانے ہندوستان کو بھی ختم کر گئی ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان نے ایک نیا جنم لیا۔ غالب نے واقعہ ۱۸۵۷ء کو "رستخیز بیجا" کے نام سے یاد کیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ "رستخیز بجا" تھا۔ ۱۸۵۷ء نے ہندوستان نو کی بنیاد رکھی، وہ ہندوستان جو اورنگ زیب کی وفات کے وقت سسکیاں لے رہا تھا کب تک زندہ رہتا۔

قوموں کی زندگی کو ہم تین شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں مذہبی، ادبی، اور سیاسی، تنزل پذیر قوم ان تینوں چیزوں سے محروم ہو جاتی ہے اس کے ایمان میں تزلزل، اس کے ادب میں انحطاط اور اس کی سیاست میں گتھیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں کوئی ایسا مذہبی سرگروہ نہیں ملتا جو صحیح معنوں میں اس کی رہنمائی کرے اور نہ کوئی ایسا سیاست داں ملتا ہے جو قوم کے سامنے ایک مکمل لائحہ عمل پیش کرے قوموں کا زوال ایک یا دو دن کی بات نہیں ہوتی سال یا دو سال کا واقعہ نہیں ہوتا قوم کو بنتے اور بگڑتے صدیاں لگجاتی ہیں۔

۱۸۵۷ء کا واقعہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا منحوس ترین سانحہ ہے یہ ایک ایسا جانگداز اور روح فرسا صدمہ تھا کہ مسلمان اس کی تاب نہ لا سکے اور وہ دماغی توازن کھو بیٹھے، مذہب جو مسلمانوں کا اوڑھنا اور بچھونا ہے ردگردانی شروع ہوئے عرصہ ہو چکا تھا لیکن اس غیر متوقع آفت نے رہے سہے عقائد اور اعتقادات بھی ڈھیل کر دیئے اور اس طرح ایمان میں تزلزل کی بنیاد پڑی۔

بھولا ہوا خواب جب حقیقت کا روپ دھارن نہ کر سکا تو مسلمانوں کے حواس مختل ہو کر رہ گئے وہ سمجھتے تھے کہ دہلی کی سلطنت ان کی میراث ہے اور اس کی بقا اور حفاظت ان کی سیاست جب یہ ہاتھ سے نکل گئی تو ان کی سیاست کا خاتمہ ہو گیا، انہیں اب کوئی شاہراہ عمل سجھائی نہیں دیتی تھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے۔ ان کی بدحواسی، بےچینی اور اضطراب نے انہیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ کاوش فکر کرتے اور اس غیر متوقع مصیبت کا کوئی ٹھیک حل ڈھونڈ نکالتے یہ تھے وہ حالات جہاں سے سیاست میں پیچیدگیاں اور غلط فہمیاں شروع ہوئیں۔

وہ کل کی نوخیز چھوکری "سلطنت کا سایۂ عاطفت" اٹھ جانے کے بعد مبہوت کر رہ گئی۔ یتیمی کے صدمے نے اس سے بھلے اور برے میں امتیاز کرنے کی قوت سلب کر لی اور وہ اپنے خیر خواہوں اور بد خواہوں میں تمیز نہ کر سکی

ناز و نعم میں پلی ہوئی شاہی حرم اور دربار میں پرورش پائی ہوئی بیگموں اور شاہوں کے منہ لگی ہوئی کیا جانتی کہ مصیبت کیا چیز ہوتی ہے جس وقت قلعہ سے نکالی گئی نادان تھی عوام کے نرغہ میں جا پھنسی جوانی کے دن تھے اور امنگوں کی راتیں اُن سے کھل کھیلی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف عزت ہاتھ سے جاتی نظر آئی تو دوسری طرف اثاثہ لٹتا دکھائی دیا، غرضکہ اسطرح ادب میں انحطاط رونما ہوا۔

ایمان میں تزلزل، سیاست میں پیچیدگیاں اور ادب میں انحطاط ان تینوں نے بلکہ مسلم قوم کے لئے نہ صرف زوال کے سامان مہیا کر دیئے بلکہ اُسے اس مقام تک لے آئے جہاں اس کی بقا کے لئے کسی مرد کامل کی ضرورت لاحق ہوئی۔ توحید کی امانت سینوں میں رکھنے والے اب نہ صرف ایک مذہبی رہنما کے محتاج تھے بلکہ انہیں اپنی بقا کے لئے ایک مجتہد ادیب کی ضرورت تھی اور سیاست میں ایک دور اندیش اور تجربہ کار سیاست داں کی، ان کی کشتیٔ حیات بادِ حوادث کے تیز و تند جھونکوں کی تاب نہ لاکر پاش پاش ہوئی جا رہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت چند افراد خدا کا نام لے کر قوم کو بچانے کا عزم کر کے اُٹھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی اصلاح ایک شخص کے بوتہ کا کام نہ تھا، مولوی ابوالقاسم مذہبی اصلاح کا بیڑہ اُٹھاتے ہیں اور دیوبند میں ایک مذہبی جامع کی بنیاد رکھتے ہیں، سرسید سیاسی رہنما کا کام اپنے ذمے لیتے ہیں لیکن اس گر سے بخوبی واقف ہیں کہ سیاست کی پہلی سیڑھی تعلیم ہے اسی لئے وہ علوم جدید و قدیم کی تعلیم مسلمانوں میں عام کرنے کی غرض سے علیگڑھ میں ایک مرکزی دارالعلوم کا سنگِ بنیاد رکھتے ہیں اور ادب کی اصلاح اور صحیح نہج پر لانے کا سہرا حالی کے سر رہتا ہے۔

حالی اُردو ادب میں پہلی ہستی ہے جس کے یہاں اجتماعی شعور پایا جاتا ہے حالی کو اپنے سے زیادہ قوم اور وطن کا خیال ہے وہ مسلمانوں کی بے حسی اور بے دلی سے حد درجہ متاثر ہیں اُن کی زندگی کا ہر لمحہ اس بے حسی اور بے دلی کو دور کرنے کے لئے وقف تھا انھوں نے ادب کو پہلی مرتبہ ایک وسیط اور ذریعہ کے طور پر استعمال کیا حالی کے یہاں ادب مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ یہ محض اُن کے اظہار خیال کا ذریعہ ہے حالی کے نزدیک مقصد اتنا اہم ہے کہ وہ نظم و نثر دونوں کو اس ہی مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں حتیٰ کہ غزل کی سی صنف ادب کو بھی وہ وسیط کے طور پر ہی کام میں لاتے ہیں" حالی رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا" حالی نے ماضی کے گن گائے اور حال کی بدحالی پر

نیر بہائے حالی مغرب سے مرعوب تھے وہاں کی مادی ترقیات اور علوم و فنون کے عروج نے اُن کی نظر میں خیرگی پیدا کر دی تھی، حالی کی یہ کیفیت بہت کچھ سرسید کی صحبت اور قرب کا نتیجہ تھی، حالی کے کردار میں یہ ایک عجیب خصوصیت تھی کہ وہ شخصیتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے، حالی نے سرسید سے متاثر ہو کر عمر بھر "پیروئ مغربی" کے راگ الاپے حالی نے ایک پختہ کار اور ہوشیار فن کار کی طرح ہمارے سامنے دو متضاد تصویریں پیش کر دیں، ماضی کی رونق اور حال کی خستگی اس درماندگی اور خستہ حالی کا علاج حالی نے "پیروئ مغربی" تجویز کیا۔

لیکن حالی ہی کے زمانے میں ایک شخص نے یہ آواز بلند کی کہ ہماری موجودہ پستی، افلاس اور ادبار کی وجہ ہماری مغرب کی اندھی اور کورانہ تقلید ہے ہم نے جادۂ حق کو چھوڑ دیا اس لئے ہم قعرِ مذلت میں گر پڑے۔ یہ آواز اکبر کی تھی اکبر نے مسلمانوں کی بہبودی اور خوشحالی اسی میں دیکھی کہ وہ سختی کے ساتھ اپنے ماضی سے وابستہ رہیں۔ حالی مسلمانوں کے ماضی کو روشن اور شاندار تسلیم کرتے ہوئے بھی حب کشمکش اور الجھن کے دوراہے پر پہنچتے ہیں تو مسلمانوں کو "آتش نمرود" میں "بے خطر" کود پڑنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن اکبر اس اندھی تقلید کے قائل نہیں قدامت پسندی انکا مذہب اور مشرقیت ان کا ایمان ہے "غیرتِ قومی" اکبر کے مزاج کا جزو لاینفک ہے خواہ تعلیم ہو یا سیاست مذہب ہو یا معاشرت اکبر کبھی غیرت قومی کا دامن نہیں چھوڑتے۔

اکبر کے بعد جس شخص نے مغربی تہذیب کی یلغار کو رد کرنے کی کوشش کی وہ اقبال تھے اکبر نے قریب قریب ان ہی چیزوں کی مخالفت کی تھی جن چیزوں کی اقبال نے کی یعنی مغرب کی اندھی تقلید، عورتوں کی آزادی اور ان کی موجودہ تعلیم مشینوں کا غلبہ، مغربی تعلیم، قرآن اور مذہب سے بے نیازی وغیرہ وغیرہ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اکبر کے منہ سے جب ہم ان باتوں کی مخالفت سنتے ہیں تو ہم انہیں محض تفریح کی چیز سمجھ کر ٹال جاتے ہیں لیکن جب اقبال کے منہ سے سنتے ہیں تو ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں اس سے پہلے کہ میں یہ واضح کرنے کی کوشش کروں کہ کیوں اقبال کی آواز کوہ ندا کی آواز کا اثر رکھتی ہے کہ ہم بے اختیارانہ طور پر اس کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں اور کیوں اکبر کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی یہ مناسب ہوگا کہ میں ایک ہی موضوع پر اکبر کے اور پھر اقبال کے اشعار آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کر دوں اشعار کی تعداد صبر آزما ہے لیکن میرے مقصد کی وضاحت کے لئے یہ ایک ناگزیر سا امر ہے۔ اکبر

مغرب کی اندھی تقلید کے بارے میں کہتے ہیں ؎

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے   بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی   یورپ کا تری رگوں میں خون بھی ہے

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو   باتیں جو بری ہیں اُن سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر   اسمیں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

خدا جانے کہا کس نے یہ کسی دن عقل سے   کہ مشرق کو نظر آتا نہیں مغرب سے چھٹکارا
مضر ہیں مذہبی قیدیں مناسب ہے شکست انکی   مزاحم ہیں مگر یہ مولوی ان کا نہیں چارا
وہ چھینٹے دیجئے اُن کو حکیمانہ طریقوں سے   کہ بجھ کر راکھ ہی ہو جائے مذہب کا یہ انگارا
چلے مقراض تدبیر ایسے پیچیدہ طریقوں سے   کہ جڑ کٹ جائے مذہب کی یہ گھر ہو منہدم سارا

رات اُس مس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار   ہائے وہ حُسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں   گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں
دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں   سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں
عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار   دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار
تو اگر عہدِ وفا باندھ کی میری ہو جائے   ساری دُنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے
شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی   ناز و انداز سے تیوری وہ چڑھا کر بولی
غیر ممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے   بوئے خوں آتی ہے اِس قوم کے افسانوں سے
کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں   آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں
مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ ہیں یہ نیک نہاد   ہے منوز ان کی رگوں میں اثرِ حکم جہاد

عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح — اب زمانے پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ — دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ — سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ

مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جاں نہیں — نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلماں نہیں

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو — ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی ماضی سمجھو

اقبال کہتے ہیں ؎

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں — امتی باعثِ رسوائیِ پیغمبر ہیں

بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں — تھا براہیم پدر اور پسر آذر ہیں

بادہ آشام نئے بادہ نیا خم بھی نئے — حرمِ کعبہ نیا بت بھی نئے تم بھی نئے

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے — تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے

حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے — تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر — اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے — مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے

صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق — کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

عورتوں کی تعلیم اور آزادی کے بارے میں اکبر کی ظرافت کی چھلجھڑیاں ملاحظہ ہوں ؎

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے — خدمت میں ہے دلیری اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر — شوہر پرست بی بی پبلک سپرنٹ لیڈی

اُن سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی — یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں — حجاب اُن کو نہیں آتا، انہیں غصہ نہیں آتا

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی — اب شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں — میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں

ان اشعار سے کہیں آپ یہ غلط نتیجہ نہ نکال لیں کہ اکبر تعلیم نسواں کے مخالف تھے، یہ اکبر کے ساتھ زیادتی ہو گی وہ عورتوں میں تعلیم کا رواج دیکھنا چاہتے تھے لیکن کس قسم کا یہ ملاحظہ ہو ؎

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں — ایک ہی بات فقط کہتا ہے یاں حکمت کو
دو اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم — قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اس سلسلہ میں اکبر کی ایک طویل "تعلیمِ نسواں" ایک پنڈت صاحب کی فرمائش سے دیکھنے کی چیز ہے۔ اقبال "آزادیِ نسواں" کے عنوان سے کہتے ہیں ؎

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا — گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش — مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خرد مند

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

اسی سلسلہ میں اقبال کے اور اشعار پیش ہیں ؂

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لئے اسکا ثمر موت

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

راز ہے اسکے تبِ غم کا یہی نکتۂ شوق
آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود

تعلیم کے بارے میں اکبر کہتے ہیں ؂

وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لئے
خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جنابِ ڈارون کو حضرتِ آدم سے کیا مطلب

نظر اُن کی رہی کالج ہی میں علمی فوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

طفلِ دل محوِ طلسمِ رنگ کالج ہو گیا
ذہن کو تپ آئی اور مذہب کو فالج ہو گیا

کہاں جہنم و جنت کہاں عذاب و ثواب
دل اب تو رہتے ہیں کالج کے فیل پاس کے ساتھ

تکمیل میں اُن علوم کے ہو مصروف
نیچر کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف

لیکن تم سے اُمید کیا ہو کہ تمہیں
عہدہ مطلوب ہے وطن مالوف

اقبال کہتے ہیں ؂

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے حاصل نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی / اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے ... مگر / چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

پُر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر / خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم / ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم / کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

نئی تہذیب کے متعلق اکبر کہتے ہیں ؎

نئی تہذیب سے ساقی نے ایسی گرمجوشی کی / کہ آخر مسلموں میں روح پھونکی بادہ نوشی کی

مجھکو حیرت ہے کہ ہیں کیس گزٹ کی چیلیاں / حشر برپا کر رہی ہیں مغربی البیلیاں

ناز تھا انکو بہت اپنے بدن کی ساخت پر / اکڑ بیٹھن میں مرے اک دوست عریاں ہو گئے

غاشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق / ان حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق

لیلیٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ پہنا / ٹوکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا

حسن و جنوں بجا تو اپنی جگہ ہیں لیکن / بے لطف بحرِ ہستی، فیشن کے ساتھ بہنا

انگلش ڈریس اونکا جو کل بزم میں دیکھا / اکبر نے کہا یہ تو خرابی کے ہیں آثار

معنی میں بھی ہو جائے گا آخر کو تغیر / تبدیلیٔ صورت کے رہے گر یہی اطوار

حالی کی عبارت سے حجاب آنے لگے گا / شرمائے گے کرتے ہوئے اسلام کا اظہار

آخر کو رہو گے نہ ادھر کے نہ ادھر کے / انگریز بھی کھنچتے رہیں گے قوم بھی بیزار

اقبال کہتے ہیں ؎

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب / کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید / ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیبِ حاضر میں / بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے — یہ رعنائی یہ بیداری یہ آزادی یہ بیباکی

تغیر آگیا ایسا تدبر میں تخیل میں — ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار — مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار

کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار — ہوگئی کس کی نگاہ طرزِ سلف سے بیزار؟

قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں — کچھ بھی پیغامِ محمد کا تمہیں پاس نہیں

اقبال نے جب یورپی تہذیب اور تمدن کا بہ نظرِ غور مطالعہ کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

لیکن یہ سنکر آپ کو تعجب ہوگا کہ اکبر نے سات سمندر دور ہوتے ہوئے بھی اقبال سے پیشتر یہ کہدیا تھا ؎

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو — بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

برق گرجائیگی ایک دن اور اڑجائیگی بھاپ — دیکھنا اکبر بچائے رہنا اپنے آپ کو

نفسِ انسانی پر مشینوں کے غلبہ کے بارے میں اکبر اور اقبال دونوں نے اپنے اپنے مخصوص رنگ میں اظہارِ خیال کیا ہے ؎

اک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے لوگ دین سے — اک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے (اکبر)

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات (اقبال)

قرآنِ کریم مسلمانوں کے لئے آئینِ حیات کا کام دیتا ہے مسلمانوں نے اگر دنیا میں شہرت و نیک نامی حاصل کی عظمت و بزرگی پائی، ترقی و سروری کے مدارج طے کئے تو یہ سب اسی آئینِ حیات پر عمل پیرا ہونے کا صدقہ تھا۔ اکبر و اقبال دونوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ع

اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

اکبر کہتے ہیں ؎

صوم ہے ایمان سے، ایمان رخصت صوم گم — قوم ہے قرآن سے قرآن رخصت قوم گم

اور اقبال کہتے ہیں ؎

از یک آئین مسلماں زندہ است　　پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است

اشعار کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے اِس کا مجھے احساس ہے لیکن کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں میرے مقصد کی وضاحت کے لئے یہ ایک ضروری امر تھا آپ نے اِن اشعار سے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ اساسی چیزوں کے متعلق اکبر اور اقبال دونوں ہم خیال ہیں لیکن اَب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اکبر کے مقابلے اقبال کیوں زیادہ کامیاب رہے اِس کے کئی اسباب ہیں۔

آرٹ کی عظمت بہت کچھ آرٹسٹ کی شخصیت اور اُس کے عقاید پر منحصر ہے اکبر اور اقبال کی شخصیت میں بعد المشرقین ہے ایک دیو پیکر ہے تو دوسرا بونا' ایک علوم جدید و قدیم کا ماہر تو دوسرا صرف علوم قدیم سے آشنا' ایک مشرق و مغرب کے بہترین افکار سے مزین تو دوسرا گنے چنے لوگوں کے خیالات سے آگاہ' ایک فلسفی تو دوسرا صوفی بعد میں اور ظریف پہلے' اقبال کے کلام میں تاثیر ان کے شاعرانہ اعجاز سے نہیں ہے کیونکہ جہاں تک فنی خصوصیات کا تعلق ہے اکبر کا کلام کسی لحاظ سے' کسی پہلو سے اقبال کے کلام سے کم نہیں ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ جو قدرت اکبر کو زبان پر حاصل تھی وہ شاید اقبال کو کبھی نصیب نہ ہوئی - اس فرق کی وجہ جیسا کہ میں ابھی لکھ چکا ہوں شاعرانہ اعجاز نہیں بلکہ شخصیتوں کا فرق ہے اکبر کی شخصیت نہ اِتنی بلند ہے جتنی اقبال کی ہے نہ اس میں وہ ہمہ گیری ہے جو اقبال کے یہاں ہے۔ زبان پر اگر قدرت ہے تو شعر میں شگفتگی' برجستگی' سلاست' طلاقت اور روانی پیدا ہو سکتی ہے - شعر میں حسن بھی پیدا ہو سکتا ہے لیکن جب تک محرکاتِ شعری عظیم نہ ہوں آرٹ میں بلندی نہیں آ سکتی - اکبر کے یہاں تخریبی پہلو نمایاں ہے اِقبال کے یہاں تعمیری پہلو پیش پیش ہے -

اکبر کے یہاں سوجھ تھی اور بلا کی سوجھ تھی لیکن اِس کا کیا علاج کہ ان کی سوجھ میں بوجھ کو بہت کم دخل تھا' اکبر ہر چیز کے مضحک پہلو کو پہلی نظر میں دیکھ لیتے ہیں اور اُسی کو اساسی پہلو قرار دیکر طنز و ظرافت کے تیروں کی بوچھار شروع کر دیتے ہیں اکبر زیادہ تر چیزوں کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں' اقبال نے ان چیزوں کا مطالعہ ساحل پر کھڑے ہو کر محفوظ و مثبت مقام سے نہیں کیا بلکہ اُنہوں نے طوفان سے چشمک زنی کی' وہ موجوں سے کھیلے اور چٹانوں سے ٹکرائے' اِسی چشمک' کھیل اور ٹکر سے وہ شہ پارہ وجود میں آیا جسے ان کے کلام کو زیادہ تر موثر' زیادہ بلند اور وقیع بنا دیا برخلاف اِس کے اکبر اِن چیزوں کو غولِ بیابانی سمجھتے رہے اُنہوں نے ایک محفوظ اور مثبت مقام سے طوفان کا صرف نظارہ کیا اِسی لئے وہ اس کی تہ تک

نہ پہنچ سکے ان کا مطالعہ کچا، خام اور ناقص رہا، اسی لئے وہ جزئیات پیش کرنے سے قاصر رہے وہ برائیوں پر زور دیتے ہیں جو پہلی نظر میں دکھائی دے جاتی ہیں، اکبر بات کو تنگڑ بنا کر پیش کرتے ہیں اور معمولی چیزوں پر زور دیتے ہیں ان کا وار ہمیشہ کوٹ پتلون اور سایہ پر ہی پڑتا ہے اگر میں یہ کہوں کہ اکبر اوچھے ہتھیاروں سے وار کرتے ہیں تو شاید بیجا نہ ہوگا اقبال ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن پر بھی نظر رکھتے ہیں اور چیزوں کے حسن و قبح کا انحصار ان کی ظاہری سج دھج پر نہیں بلکہ ان کی تمام خصوصیات پر رکھتے ہیں ان باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اکبر کی ناکامیابی کا سبب ان کے مطالعہ کی سطحیت اور فکر رسا کی کمی ہے۔ لیکن صرف اسی چیز کو اکبر کی ناکامیابی کی وجہ قرار دینا اکبر کے ساتھ ناانصافی ہوگی اکبر کے زمانے میں مغربی سیلاب نیا نیا تھا نئے سیلاب میں شدت ہوتی ہے، طاقت ہوتی ہے، زور ہوتا ہے، اچھے اچھوں کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں چنانچہ یہی حال اس وقت بھی ہوا سلطنت کے نقصان اور تعلیم کے فقدان نے یہ امر ذہن نشین کردیا تھا کہ ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبہ میں مغرب کی پیروی شروع کردیں مغربی معاشرت اور تمدن کا غائر نظر سے مطالعہ کسی نے نہیں کیا غلام قوم کے قوائے ذہنی مفلوج ہوجاتے ہیں وہ اچھے اور برے میں تمیز نہیں کرسکتی خوب و زشت میں امتیاز نہیں کرسکتی، اقبال کے الفاظ میں ؎

بھروسہ کر نہیں سکتے غلامی کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

فاتح کا ہر عیب مفتوح کی نظر میں حسن بن جاتا ہے اس کے علاوہ دور سے چمکنے والی چیز سونا ہی نظر آتی ہے۔ آقاؤں کا ہر فعل غلاموں کے نزدیک قابلِ تقلید ہوتا ہے اس کے علاوہ مغربی معاشرت میں ظاہری چمک دمک کچھ ایسی تھی کہ یہاں کے لوگوں کی نظر خیرہ ہو کر رہ گئی غرضکہ ایسے ماحول میں جب ذہن مفلوج ہوگئے تھے اور نظریں خیرہ، اکبر نے تن تنہا مغربی یلغار کو روکنے کی کوشش کی اکبر اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے حقیقت یہ ہے کہ یہ کام ایک شخص کے بس کا تھا بھی نہیں ایک اکبر تو کیا اگر دس اکبر بھی ہوتے تو اس سیلاب کو نہ روک سکتے۔ میرا مقصد اس سے اکبر کی عظمت گھٹانا نہیں ہے اکبر کی اتنی اہمیت تو مسلم ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ ہمارے افکار و خیالات مغربی رنگ میں رنگے جاچکے تھے انہوں نے اپنی بے پناہ طنز و ظرافت کے بل بوتہ پر مغربی سیلاب پر اتنی شدید اور کاری ضرب لگائی کہ علیگڈھ ہیئت اور برطانوی سامراج والوں کا بڑھتا ہوا اثر اور ترقی کرتی ہوئی طاقت تحس نحس ہو کر رہ گئی۔ علیگڈھ نے برطانوی تمدن کی

حمایت کی تھی اور انہیں مسلمانوں میں عام کرنا چاہا تھا لیکن اکبر نے اس ڈھول کا پول کھول دیا۔ اکبر کو اگر ہم حکیم نہیں کہہ سکتے تو نقاد ضرور کہہ سکتے ہیں۔ برطانوی عظمت کو منجملہ جن چیزوں سے دھکا پہنچا ہے اُن سیاسی تحریکات کے بعد سب سے پہلے اکبر کا نام آتا ہے۔ اکبر کا یہی کمال کیا کم ہے کہ اقبال کے لئے زمین ہموار کر دی۔ اکبر کی عدم موجودگی میں اقبال کے کلام کا کیا اثر ہوتا یہ صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے بیان نہیں۔

اقبال کی کامیابی اور اکبر کی ناکامیابی کی ایک وجہ اور ہے۔ اکبر نے اپنے خیالات کے ابلاغ کے لئے جو وسیلہ اختیار کیا وہ طنز و ظرافت تھی۔ لطیف، نازک اور پُرمعنی ظرافت ہر شخص کے بس کی نہیں ہوتی اسی لئے اکبر کا کلام زیادہ تر قہقہوں میں اُڑا دیا گیا۔ اس معنویت کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی۔ اکبر نے ہنسا کر رُلانا چاہا تھا۔ وہ تبسم نہیں بلکہ آنسوؤں کا پیغام لائے تھے لیکن عوام کی کم فہمی اُسے صرف قہقہہ سمجھ کر رہ گئی۔ یہ نہ دیکھا کہ اس قہقہہ میں کتنا کرب، کتنا سوز، کتنی بے چینی پوشیدہ ہے۔ اکبر نے حکومت کے خوف سے سرد موسم اور پُرغبار ہواؤں میں پناہ ڈھونڈنے کے لئے ظرافت کے لحاف کو ترجیح دی۔ طنز و ظرافت کا تعلق جہاں جذبات و حسیات سے ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ ذہن و دماغ سے ہوتا ہے۔ اکبر نے متفرق اشعار کہے لیکن ذہن پر جب تک کوئی عمل مسلسل نہ ہو اثر نہیں ہو سکتا۔ اقبال کی کامیابی بڑی حد تک اکبر کی ناکامیابی کی رہینِ منت ہے۔ اکبر ہی کا ایک شعر ہے ؎

اکبر کا نغمہ قوم کے حق میں مفید ہے
دل کو تو گرم رکھتا ہے وہ بے ثمر سہی

یہ اقبال کی دانشمندی کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ انہوں نے خودی کے ہتھیار اس وقت استعمال کئے جب مسلمانوں کے دل اکبر کے نغمے سے تازہ تازہ گرم تھے۔

اکبر اور اقبال کے مزاج میں کتنا فرق تھا یہ آپ ان دو اشعار سے معلوم کر سکتے ہیں ؎

اس میں بُرائی کیا تھی جو میں — احیائے رسم دیرینہ رہا
آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا — منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اکبر تہذیب مغربی کی مخالفت کرتے رہے لیکن لوگوں نے اُسے قبول کر ہی لیا ؎

جلوۂ ساقی دے جان لئے لیتے ہیں — شیخ جی ضبط کریں یہ تو بچے لیتے ہیں

اکبر کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ مغرب کی ترقی لادینی، عریانی اور چنگ و رباب سے ہے یہ انکے سطحی مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ اقبال کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے بتایا کہ

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب — نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
محکمی او نہ از لادینی است — نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوت افرنگ از علم و فن است — از ہمیں آتش چراغش روشن است

اکبر کی آنکھوں پر قدامت کی عینک تھی، قدامت پرست انسان تھوڑا بہت متعصب بھی ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی تمام خوبیاں اور بھلائیاں اسی تہذیب معاشرت اور تمدن سے ہیں جس کا کہ پیرو ہے وہ تو کنویں کی مینڈک ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بحر کی وسعتیں ایک لفظِ مہمل ہے اکبر نے جو شیخ جی کے بارے میں کہے تھے وہ ان پر بھی چسپاں ہوتے ہیں۔ ؎

حالِ دنیا سے بے خبر ہیں آپ — گو تقدس مآب بیشک ہیں
شیخ پر یہ قول صادق ہے — چاہِ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

اقبال کے یہاں سب کچھ ملتا ہے لیکن تعصب نہیں ملتا وہ جانتے ہیں کہ مغرب باوجود اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اسقدر پست ہونے کے ہمیں بہت کچھ دے سکتا ہے اور وہ بہت کچھ ہے ندرت فکر و عمل۔

ندرت فکر و عمل کیا شئے ہے ذوقِ انقلاب — ندرت فکر و عمل کیا شئے ہے ملت کا شباب
ندرت فکر و عمل سے معجزات زندگی — ندرتِ فکر و عمل سے سنگ خارا لعلِ ناب

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد نے بھی قریب قریب یہی بات کہی تھی۔

"اہل یورپ کی عظمت سلطنت نہیں ہے بلکہ اُن کی عظمت ان علوم میں ہے جو جدید ایجاد ہوئے ہیں۔ اور ہوتے جاتے ہیں اور جن علوم کے ذریعہ سے انہوں نے ریل اور تار برقی اور اسٹیمر اور ہزارہا قسم کی کارآمد کلیں بنا ڈالی ہیں"

اکبر کی ناکامی کی ایک وجہ انکی تعلیم کا منفی پہلو بھی ہے انہوں نے صرف یہ کہدیا کہ یہ راستہ جس پر تم گامزن ہو خطرناک ہے لیکن یہ نہ بتا سکے کہ یہ دوسرا راستہ بھی ہے جو تمہیں منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے اکبر نے

انسانوں کو اور انسانوں کے سماج کو چھوئی موئی سے زیادہ نازک سمجھ لیا تھا کہ جہاں چھوا اثر جھا گیا شاید وہ ارتقا کے قائل نہ تھے ۔

یا الٰہی یہ کیسے بندر ہیں

ارتقا پر بھی آدمی نہ ہوئے

شاید انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ ع اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔ وہ سماج ہی کیا جسمیں لچک نہ ہو بڑے سے بڑا درخت اگر آندھی کا مقابلہ کرے گا تو منہ کی کھائے گا زندہ اور قایم وہی رہتا ہے جس میں جھکنے اور طوفان کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہے ممکن ہے کہ مغربی سیلاب بھی ایک تاتاری فتنہ ثابت ہو اجسطرح اسلام تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ حال ہوا اسیطرح اس نے ترقی بھی انہیں کے بل بوتے پر کی ۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے ‏ ‏ ‏ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اقبال کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ انہوں نے اسلام کو ٹھوس اور جامد نہیں قرار دیا بلکہ نامی اور جدلیاتی تصور کیا ۔ اسی سلسلے میں سید سلیمان ندوی کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں ۔

"پچاس برس کے تجربے نے یہ بتایا ہے کہ نئی روشنی کی بہترین شعاع وہ ہے جو جدید و قدیم تعلیم کی مثبت و منفی لہروں کے ملنے سے نکلتی ہے ان بجلیوں کو علیحدہ کر دیجئے تو نئی یا پرانی کوئی روشنی پیدا نہ ہوگی"۔

حالی کے یہاں مفاہمت ہے، اکبر کے یہاں احساس شکست ہے اور "لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو" کی صدائے بازگشت ہے، لیکن اقبال کے یہاں اعلان جنگ ہے اور یہی وجہ اکبر کی ناکامی اور اقبال کی کامیابی کی ہے، حالی اور سر سید کے یہاں اندھا دھند تقلید کرنے کا نعرہ ہے اور اکبر کے یہاں قدامت پسندی کی تلقین ہے ۔ ظاہر ہے کہ دونوں کے نقطۂ نظر انتہا پسند تھے انہیں توازن کی ضرورت تھی، چنانچہ اقبال نے ہمیں ایسا پیغام دیا جس میں اعتدال اور توازن ہے مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے یہاں سر سید حالی اور اکبر کی بہترین تعلیم ملتی ہے یعنی وہ تعلیم جس میں نہ انتہائی تعصب سے کام لیا گیا ہے نہ انتہائی عقیدت سے بلکہ ایک سوجھ بوجھ رکھنے والے کے غور و فکر کا نتیجہ ہے ۔ آپ خودی کے فلسفے کو کچھ دیر کے لئے نظر انداز کر دیجئے پھر دیکھئے کہ اقبال کے یہاں کیا رہ جاتا ہے، یہی سر سید، حالی اور اکبر کے خیالات کی صدائے

بازگشت، وہی مشرقیت کو ہاتھ سے نہ جانے دو لیکن مغرب سے بھی جتنا حاصل کر سکو کر لو۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا تقاضہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

نور محمد ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)

"اقبال کا تصورِ عشق"

(فرید الدین شمسی۔ تبسم متعلم سال دوم)

عشق شور انگیز را ہر جادہ در کوے تو برد
بر تلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو برد

عشق۔ تخلیقی قوت انقلاب کا نام ہے۔ یہ ایک سیلان ہے تخلیقی قوتوں کا۔ عشق کی تخلیقی قوت کے ذریعہ ہی جذب باہمی۔ نشو و نما اور عمل ارتقاء کی کماحقہ، تشریح ہو سکتی ہے۔ عشق محض ایک جمالیاتی تخیل ہی نہیں ہے۔ نہ ہی فرائڈ کی نظریات کے مطابق یہ دبی ہوئی نفسانی خواہشات کی تسکین کا ایک ذریعہ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عشق وجود کا اساسی محرک یعنی ولولہ حیات ہے۔ عاشق کبھی زندگی کو تخیلی پیکر، یا مجہول اور معطل خیال نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ کو ماحول کے تقاضوں اور عصری میلانات کے تحت نہیں ڈھالتا۔ بلکہ اپنے ماحول اور اس سے وابستہ تمام حالات کو اپنے دھڑکتے ہوئے تخلیقی "انا" کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ وہ فی الحقیقت انقلابی ہوتا ہے۔

حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

عشق کو اگر محض ذوقِ جمال اور احساسِ جمال کی تسکین تک ہی محدود کر دیا جائے گا تو یہ عشق کی توہین ہو گی - عشق کا مفہوم اِن اصطلاحات سے کہیں زیادہ وسیع اور بالاتر ہے -

عاشق آں نیست کہ لب گرم فغانے دارد
عاشق آں است کہ بر کف دو جہانے دارد

عشق سے اقبال وہ جوش و جذان و حرکت مراد لیتے ہیں - جس سے ایک طرف تو وجود میں بے پناہ گہرائی پیدا ہوتی ہے - اور دوسری طرف ذات کی قبا کے لئے صفات کا تانا بانا تیار ہوتا ہے - نہ صرف یہی بلکہ وہ عشق کو ایک عالمگیر تکوینی عنصر قرار دیتے ہیں - اِن کے خیال کے مطابق کائنات کے ہر ذرہ میں عشق کی قوت موجود ہے - جو اسے حرکتِ پیہم سے روشناس کرتی ہے' افلاطون اور ابنِ سینا کے افکار کے مجموعے اکٹھا کر دیکھئے' دونوں فلسفی اِس بات پر متفق ہیں - کہ عشق وہ قوت ہے جو کائنات کے منتشر اجزاء میں باہم ربط اور تسلسل قایم کئے ہوئے ہے - اور یہی قوت جب انسانی وجود کی گہرائیوں میں سے انگڑائیاں لے لے کر ابھرتی ہے - تو انسان کی یہ حیاتِ فانی - حیاتِ دوام کا روپ دھار لیتی ہے - اقبال اِس تصور کے حامی ہیں - چنانچہ اپنی نظم "محبت" میں اِسی خیال کو نہایت لطیف انداز اور بلیغ پیرایہ میں بیان کیا ہے - ملاحظہ ہو عشق کی تخلیق سے پہلے کی کائنات کا منظر -

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے
قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلّم سے
کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی اِبتدا گویا
ہویدا تھی نگینہ کی تمنا چشمِ خاتم سے

یعنی کائنات کے تمام مظاہر وجود میں آ گئے تھے لیکن منتشر اور پریشان حال تھے - باہمی ربط و نظم جو وجود کی جان ہے - اِن مظاہر میں مفقود تھا - اور ان کے واسطے کسی عالمگیر شیرازہ بند کی ضرورت تھی -

اس کے بعد کیا ہوا ۔ ملاحظہ ہو۔

سنا ہے عالمِ بالا پہ کوئی کیمیاگر تھا ؛ صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے
لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ ؛ چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ روحِ آدم سے
نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیاگر کی ؛ وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسمِ اعظم سے
بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب ؛ تمنائے دلی آخر بر آئی سعیِ پیہم سے
پھرایا فکرِ اجزا نے اسے میدانِ امکاں میں ؛ چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے

اس شوخ و طرار کیمیاگر یعنی (انسان) نے وہ نسخہ چرا کر اب ان اجزا کی تلاش شروع کی جو اس میں تحریر تھے۔ اور آخر کار انہیں پا لیا۔ وہ اجزا کون کون سے ہیں اقبال کی زبان سے ملاحظہ ہوں۔ صرف رمز آشنا کی نظر ہی اس کا سراغ لگا سکتی تھی۔

چمک تاروں سے مانگی چاند سے داغِ جگر مانگا ؛ اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی ؛ حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابنِ مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی ؛ ملک سے عاجزی افتادگی تقدیرِ شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں ؛ مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے

اس مرکب کے چند چھینٹوں نے کائنات کا نقشہ بدل دیا۔ سکون و جمود کی جگہ حرکتِ پیہم نے لی۔ حرکتِ پیہم سے ولولۂ حیات اور قوتِ نمو وجود میں آئے۔ اور اسی ولولۂ حیات کی بدولت عالم میں وہ گہما گہمی۔ چہل پہل آب و رنگ اور رونق پیدا ہوئی جن کو دیکھ کر آج تک ہمارے چشمِ تصور دنگ ہے۔

عیاں جنبش ہوئی ذروں نے لطفِ خواب کو چھوڑا ؛ گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے ؛ چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

عشق زندگی کا بنیادی محرک ہے لہذا زندگی کے تمام مظاہر عشق سے ہی عبارت ہیں۔ حیاتیاتِ جدید کا ایک مسئلہ یاد آ رہا ہے کہ پھولوں اور پتیوں کی بھینی بھینی خوشبو اور ان کے شوخ و شنگ رنگوں کی بدولت کیڑے مکوڑے ان کی طرف بے اختیاری کے عالم میں کھنچتے ہیں۔ اور ایک پھول کا زیرہ دوسرے پھول تک لے جاتے ہیں۔ اور

اُن کا یہ عمل بار آوری کا سبب بن جاتا ہے۔ فطرت اپنے اس مقصد کی خاطر کبھی تو پرندوں اور کیڑے مکوڑوں سے کام لیتی ہے اور کبھی ہوا کو اپنا آلۂ کار بناتی ہے۔

اقبالؔ اس مسئلہ میں بھی عشق کی رنگ آمیزی کو کارفرما پاتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ نہایت بلیغ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ "برگِ لالہ" کے متعلق فرماتے ہیں۔

اگر ایں خاک داں را واشگافی
درونش بنگری خوں ریزیٔ عشق

ایک دوسری جگہ اسی قسم کے خیال کو یوں بیان کیا ہے۔

بباغاں باد فروردیں دہد عشق — براغاں غنچہ چوں پرویں دہد عشق
شعاع مہر او قلزم شگاف است — بماہی دیدۂ رہ بیں دہد عشق

آخری مصرع قابلِ غور ہے۔ سمندر کے تیرہ و تار ماحول اور پانی کے گہرے دھندلکے میں مچھلی کا راستہ تلاش کر لینا۔ عشق کا ہی مرہونِ منت ہوتا ہے۔ اس میں اقبالؔ اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کہ ارتقاء کسی ایسے بندھے ٹکے راستے پر اندھا دھند دوڑنے کا نام نہیں جس کی بنیاد اندھی اور بے کیف میکانیت۔ جبر و لزوم اور ایک لاتناہی سلسلۂ علت و معلول پر ہو، بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جبلت عشق سے ہم آغوش ہو کر حیات کی تقویت کا باعث بنتی ہے۔ جسم نامی کے تمام حصے دراصل اسی احتیاج اور اندرونی ولولۂ حیات کی بدولت نمو پاتے ہیں۔ اور علم فطرت میں شخصیت کے قیام اور قوت تخلیق کے لئے معین و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

خودی اور عشق کی انسانی خودی کو اپنے تجربہ میں اپنے وجود کا کامل یقین ہے۔ گو الفاظ اس یقین کا ٹھیک ٹھیک احاطہ نہیں کر سکتے۔ جب ہم اپنے انا کی گرفت کرنا چاہتے ہیں تو کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جس کا مطلق تصور کیا جا سکے۔ لیکن اس کے باوجود احساس ذات، ایک ایسی روشن حقیقت ہے جس کا کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی وجود کی گہرائی اور اس حقیقت کو بغیر عشق و وجدان کے سمجھ لینا تقریباً ناممکنات سے ہے۔ ہیوم نے برکلے کی بے پناہ معروضیت کو سنگ بنیاد قرار دے کر علم کے ذریعہ زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی تو اسے محض گرمی و سردی۔ روشنی و سایہ۔ محبت و نفرت اور کرب و انبساط کی کیفیتوں کے ادراک کے سوا اور

کچھ نہ ملا ۔ اور وہ اپنے آپ کی کبھی گرفت نہ کر سکا ۔ لیکن یہ وہم کا یہ طریقۂ جستجو غلط تھا ۔ اگر انا کو علم کی معروضی اشیا میں ڈھونڈا جائے گا ۔ تو ہرگز اس کا پتہ نہیں مل سکتا اس لئے کہ یہ معروضیت سے کہیں بالاتر ہے ۔ ہماری ذات عمل اور تجربہ کرنے والی بھی ہے اور علم حاصل کرنے والی بھی ۔ لہٰذا اس پر اس صورت میں معروضیت کا اطلاق کیسے ہو سکتا ہے ۔

خودی ارادہ کا لباس پہنکر نہایت آب و تاب کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے ۔ اس کی سب سے نمایاں صورت جذبۂ عشق ہے ۔ جبکہ شخصیت کی تمام خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہو کر بروئے کار آ جاتی ہیں اور اسطرح اس روحانی قوت کے تخلیقی عناصر اپنا اظہار کرتے ہیں ۔

عشق کا مسلک یہ ہے کہ حیات اپنی محدود بنیادوں پر لامحدود تجربوں کی بنیاد رکھ سکتی ہے ۔ چنانچہ جب خودی سوز و ساز کی بھٹی میں تپ کر، درد و داغ کی چاشنی سے سیر ہو کر اور جستجو و آرزو کا سہارا لے کر عالمِ فطرت میں نمودار ہوتی ہے تو اس وقت بقول شاعر ؎

یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ، والا حساب ہوتا ہے

وجود کے اثبات کے سلسلہ میں عقل چاہے کتنے ہی حیلے حوالے پیش کرے اور شک و شبہ سے کام لے ۔ عشق اسے تسلیم کر کے ہی چھوڑتا ہے ؎

در بود و نبودِ من اندیشہ گماں ہا داشت
از عشق ہویدا شد ۔ این نکتہ کہ ہستم من

عشق سے زندگی میں شدت، استواری اور استحکام پیدا ہوتا ہے ۔ زمانہ اس کا غلام ہے ۔ اس واسطے کہ عشق زمانہ کی دسترس سے بالاتر ہے اور ہر دور کا نچوڑ ہے ۔ اپنی مشہور عالم نظم (مسجد قرطبہ) میں اقبال اس کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

یہ عشق ہی ہے جو تمام مذہبی - اخلاقی - معاشرتی اور اعلیٰ اقدار حیات میں اپنا اظہار کرتا ہے -
اور ایک بلند تر نصب العین کی کھینچتا ہے - جب ان اقدار میں سے عشق (لگن) کا عنصر ختم ہو جاتا ہے - تو یہ اقدار
بھی مُردہ ہو جاتی ہیں - گویا یوں کہنا چاہیئے کہ عالم اقدار کی بقا بھی عشق پر موقوف ہے - تمام اعلیٰ اقدار عشق
کا ہی ایک مکمل مظہر ہے ؎

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود — عشق ہے ابن السبیل، اسکے ہزاروں مقام

عشق کی بدولت ہی گرمیِ حیات و کائنات قایم و دایم ہے -

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق ہے نورِ حیات، عشق ہے نارِ حیات

عشق رُوحِ انسانی کی وہ حالت ہے جبکہ وہ اپنی شدید ترین جد و جہد اور جوش کی حالت میں ہو -
یہ حالت اپنے تقاضوں کے تحت جسم خاکی کو جس طرف چاہے لے جاتی ہے - اور تخلیق کے جن مقاصد کے
لئے چاہے استعمال کرتی ہے - ہر شخص کی زندگی ویسی ہی ہو گی جیسا اس کا عشق ہو گا - حیاتِ انسانی کی آزادی کا
انحصار اصول محبت پر ہے - انسان جس چیز سے محبت کرتا ہے - اسی کے تحت اسے حقیقی اور تخلیقی آزادی
محسوس ہوتی ہے، یہ ایک ایسی کھلی ہوئی نفسیاتی حقیقت ہے - جس کا انکار کبھی نہیں کیا جا سکتا - غرض یہ کہ
زندگی کے تمام اعلیٰ تقاضے عشق سے عبارت ہیں

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم — عشق سے مٹی کی تصویر و نمیں سوز و مبدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق — شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

علم و عشق - کے علم ایک مجموعہ ہے انسانی تجربات کا - اک نچوڑ ہے ہزار ہا سالہ کاوشوں کا - علم انسان
کے لئے اقدار کا تحفظ کرتا ہے اور نصب العین کے انتخاب کے لئے مختلف راہیں کھول دیتا ہے - لیکن
اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ علم تخلیقی نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت بہت کچھ تقلیدی سی ہے -

برخلاف اس کے عشق تخلیقی محرکات کا ایک سیلان ہے -

عشق کی گرمی سے ہے معرکہ کائنات　　علم مقام صفات - علم تماشائے ذات

عشق سکون و ثبات - عشق حیات و ممات　　علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

علم سے انسان 'بندۂ تخمین و ظن' اور 'کرم کتابی' بن جاتا ہے - لیکن عشق انسان کو رسمیت اور روایات کی پستی سے نکال کر ایک بلند مقام پر لاکر کھڑا کرتا ہے ؎

عشق کے معجزات سلطنت و فقر و دیں　　عشق کے ادنیٰ غلام - صاحب تاج و نگیں

عشق مکان و مکیں - عشق زمان و زمیں　　عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح یاب

یہ عشق ہی ہے - جو انسان کو 'تب و تاب زندگی' جستجوئے پیہم' اور لذت آرزو کی چاشنی سے آشنا کرتا ہے - سخت کوششوں' کے مرحلوں سے گزرنے کے بعد زندگی 'کندن' بن جاتی ہے' اور اپنی صاعقہ پاشیوں سے عالم کو منور کر دیتی ہے - اس کی تفسیر اقبال یوں کرتے ہیں -

شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام ؛ شورش طوفاں حلال - لذت ساحل حرام

عشق پہ بجلی حلال - عشق پہ حاصل حرام ؛ علم ہے ابن الکتاب - عشق ہے ام الکتاب

علم کا آلۂ کار عقل ہے اور عشق کا آلہ کار 'وجدان' ہے - دونوں کے دونوں انسان کو منزل کی طرف لے جاتے ہیں - لیکن دونوں کے راستہ - رکھ رکھاؤ - اور طور طریقہ میں بڑا فرق ہے - عقل حیلہ و حوالہ اور شک و شبہ سے منزل طے کراتی ہے - اور عشق و وجدان میں خود اتنی کشش ہے کہ وہ کشاں کشاں' قافلۂ حیات کو نہایت تیز گامی اور سرعت کے ساتھ منزل کی طرف لے جاتے ہیں -

ہر دو بمنزلے رواں، ہر دو امیر کارواں

عقل بہ حیلہ می برد - عشق برد کشاں کشاں

عشق زپا در آورد خیمۂ شش جہات را

دست دراز می کند تا بہ طناب کہکشاں

عقل - اشیا کے خواص معلوم کرتے کرتے اور معروضی تجربہ کا تجربہ کرتے کرتے اسباب وعلل کی ان بھول بھلیوں میں پھنس جاتی ہے جہاں سے آزادی پانا دشوار ہو جاتا ہے اور اصل حقیقت نظر سے غائب ہو جاتی ہے -

عقل در پیچاک اسباب وعلل — عشق چوگاں باز میدانِ عمل
عقل را سرمایہ از بیم وشک است — عشق را عزم ویقیں لاینفک است

عقل زندگی کو ایک رُکھی پھیکی بے مزہ اور میکانکی چیز سمجھتی ہے - اقبال نے بھی اس عہد کے اور بڑے مفکروں کی طرح اس چیز کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ اگر انسان کا وجدانی سرچشمہ خشک ہو گیا - تو اس سے زندگی کو بڑا نقصان پہنچے گا - عقل مختلف چیزوں کے درمیان ربط ونظم اور تسلسل تو قایم کر سکتی ہے لیکن تخلیق اس کے بس سے باہر ہے - ایک ایسا تمدن جس کی بنیاد خالص عقلیت پر ہو - بہت جلد تخلیق سے بے بہرہ ہو جائے گا - اور اسی میں اس کا زوال پنہاں ہے - یہی وجہ ہے کہ علم وعقل کے مقابلہ میں اقبال نے عشق ووجدان کو اسقدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے - لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ عقل بیکار ہے - اگر عشق کے جنون تخلیق وعمل پر عقل کی گرفت نہ رہے تو حیات انسانی کا تمام نظام درہم برہم ہو جائے - اصل حقیقت یہ ہے کہ عقل وعشق کا امتزاج ہی انسان کو کامیابی کے راستے پر لیجا سکتا ہے - چنانچہ اقبال خود فرماتے ہیں ؎

عقلے کہ جہاں سوز دیک جلوہ بے باکش — از عشق بیاموزد آئین جہاں تابی

نوا مستانہ در محفل زدم من — شرار زندگی بر گل زدم من
دل از نور خرد کردم ضیا گیر — خرد را بر عیار دل زدم من

عشق الٰہی یا کمال جنون | جنون دراصل عشق کی ایک حالت کا ہی نام ہے - اور عشق الٰہی کا مقصد اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ بے چون وچرا - بے دلیل وبرہان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو ایسا مانا جائے کہ کائنات کا ہر ذرہ اسی رنگ میں رنگا ہوا نظر آنے لگے - اور خود قائل کی اپنی زندگی بھی بالکل اسی

سانچے میں ڈھل جائے - عاشق (خود آگاہ) و (خدا مست ہوتا ہے - اور اپنے دیوانہ پن - مجذوبیت - اور جنون کی شدت میں عزم ویقین کے ساتھ صرف اللہ کو ہی معبود مانتا ہے - اور غیر اللہ کے عناصر سے اپنے دل کو پاک کرلیتا ہے - اس کا یہ شدید یقین و ایمان نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ سے شدید عشق و محبت کا - عشق کے فرمان پر وہ اپنی زندگی کی قربانی سے بھی نہیں ڈرتا -

عشق اگر فرماں دہد از جانِ شیریں ہم گزر
عشق محبوب است ومقصود است وجاں مقصود نیست

اس جنون یا عشق کا پہلا حکم توحید ہے - جس کی رُو سے صرف خدائے تعالیٰ ہی ہمارا مالک اور حاکم قرار پاتا ہے اور اسی کے لئے تمام بندگی اور عبادت واجب ٹھہرتی ہے ہمارا ہاتھ اُسی کے آگے دراز ہوتا ہے - غنی کے در کی فقیری ہمیں ہر چیز سے بے نیاز کرکے ہمیں فقر غیور سے مالا مال کردیتی ہے -

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

مذہب کی تمام تر رُوح عشق سے ماخوذ ہے - بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مذہب کی رُوح ہی کمالِ عشق اور کمالِ جنون ہے - اگر عشق نہ ہو تو مذہب بے جان - اصولوں - پھیکے اور کھوکھلے ضابطوں کا ایک بیکار مجموعہ ہو کر رہ جائے -

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق - عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

عشق کا رنگ چڑھنے کے بعد ہی مردِ مومن اپنے آپ کو مشکلاتِ حیات میں گرفتار کرتا ہے - فرائض و حقوق کا بار اپنے سر لیتا ہے - وہ دین کی تسخیر کرتا ہے - اللہ اور رسُول کی اطاعت کرتا اور نفس و ہویٰ کو ترک کردیتا ہے - صدق و صفا - مہر و وفا - اور اتباعِ شرع وسنت کے تمام اعلیٰ تر مظاہر عشق کے سوز دروں سے ہی عبارت ہیں -

صدقِ خلیلؑ بھی عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

عشق اور حیاتِ بعد الموت

موت کے بعد بھی شخصیت کو قائم رکھنے کا واحد ذریعہ عشق ہے۔ عشق کی بدولت خودی کائنات کے نظامِ مقاصد میں اپنے لئے ایک اہم اور بلند جگہ پیدا کر لیتی ہے۔ اور اس موت کے صدمے کو برداشت کر کے زندگی کو نئے نئے امکانات کی ایک دوسری راہ پر ڈال دیتی ہے۔ جسم گو خاک میں مل جاتا ہے۔ لیکن روح نہایت فراغت کے ساتھ عشق کی تب و تاب کے ساتھ ان امور کی تکمیل کرتی ہے اور ان عناصر کو جلا دینے میں مشغول ہو جاتی ہے جو اس کا حقیقی جوہر تھا۔ حقیقی زندگی کی بقا شخصیت کی غیر فانی جد و جہد کی حالت کو برقرار رکھنے میں ہے۔ یہ جوش اور جد و جہد کی حالت عشق ہے جو زندگی کو دائمیت بخشتا ہے۔ عشق کی بدولت موت زندگی کا ایک وقفہ ثابت ہوتی ہے، مرگ بھی ایک مقامِ حیات ہے جہاں عشق اپنا امتحانِ عزم و ثبات کرتا ہے۔

زندگی ایک میدان ہے خودی کے عملِ پیہم کے لئے۔ اور موت کیا ہے؟ یہ آزمائش ہے اس کے عزم للبقا کی۔ موت زندگی کی فنا نہیں، بلکہ یہ زندگی کے تسلسل اور فعلیت کا ہی مظہر ہے۔ اس کہ زندگی کا نشیمن ابدی حریمِ ذات سے وابستہ ہے؎

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات — کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات
خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہِ پیشِ نسیم — خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات
حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی — نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

عشق ہی حیات کو غیر فانی بنا دیتا ہے؎

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق — عقلِ انسانی ہے فانی۔ زندۂ جاوید عشق
عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے — عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

عشق کی برکت سے موت بھی ہمارے لئے جد و جہد، اور لطف و کرم کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ اور بے عشق موت دراصل زندگی سے دور جا پڑنے کے مترادف ہے؎

کھول کے کیا بیاں کروں، سرِ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیاتِ بے شرف

غرض یہ کہ عشق اصل حیات ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ زندگی کے ان گنت امکانات کو عملی شکل میں تبدیل کر دے۔ اِس عملی شکل کا اظہار کبھی آرزو کے پردے میں ہوتا ہے۔ اور کبھی سوز و ساز میں۔ کبھی جذب و مستی میں، کبھی ذوق شوق میں، کبھی بیباکی و گستاخی میں اور کبھی جرأت رندانہ میں۔

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی — ہر شوخ نہیں گستاخ، ہر جذب نہیں بیباک
فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا — یا اپنا گریباں چاک، یا دامن یزداں چاک

مولانا محمد علی کی انشاپردازی

از
(مفتی بشیر الدین احمد۔ ایم اے، لکچرار اردو رضا انٹر کالج رامپور)

ایک مشہور انگریز مدبر ـــــ نے مولانا محمد علی کے متعلق کہا تھا کہ "اُن کا قلم میکالے کا قلم اُن کی زبان برک کی زبان اور اُن کا دل نپولین کا دل ہے"۔ مولانا کی ذات میں بیک وقت ان تینوں صفات کا اجتماع تھا۔ وہ ایک جری قلب کے ساتھ ایک معجز نگار قلم اور سحر طراز زبان کے مالک تھے۔ ان کی انشاپردازی علمی و ادبی حلقوں سے زبردست خراج تحسین حاصل کر چکی ہے اور اُن کے قلم کی جادو نگاری نے انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں اپنے کرشمے دکھائے ہیں۔

مولانا محمد علی کی کوئی تصنیف کتابی صورت میں تو آج دورِ حیات میں شائع نہ ہو سکی لیکن اُن کے لاتعداد مقالے اور مضامین جو 'کامریڈ' اور 'ہمدرد' کے صفحات پر انگریزی اور اُردو میں موجود ہیں بجائے خود

تصنیفات کا ایک انبار ہیں جس سے بیشمار کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ اِس وقت بھی "مضامین محمد علی" "مقالات محمد علی" "افادات محمد علی" "نگارشات محمد علی" اور "مولانا محمد علی کے سفر یورپ" کے خطوط وغیرہ عنوانات سے ان کی اُردو تحریروں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور اُن میں برابر اضافہ ہو رہا ہے

مولانا اپنی تحریروں میں بہت طول پسند تھے اور اِس لئے اُن کے مضامین عام طور پر بہت طول طویل ہیں۔ خیالات و افکار، دلائل و براہین اور سلسلۂ واقعات کا سمندر جب موجزن ہوتا تو اُن کے رد کے نہ رکتا تھا۔ وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے اور بے تکان لکھتے چلے جاتے تھے۔ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے اُس کا کوئی گوشہ بے نقاب نہ رہتا اور جزئیات کی تفصیلات ایک ایک کر کے پیش کرتے۔ بعض اوقات وہ خود بھی طوالت سے گھبرا جاتے تھے لیکن سپر انداز نہ ہوتے تھے اِس کا سبب خود ہی بیان کرتے ہیں۔

"جو میری طرح قلم برداشتہ لکھنے پر مجبور ہو جائے وہ بیچارا کیا اختصار کر سکتا ہے لیکن میرے مضامین اور میری تقریروں کی طوالت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے قارئین اور سامعین کے دلوں میں بھی یہی خیالات بھر دوں جو میرے دل میں بھرے پڑے ہیں اور یہ خواہش مجھے بیچین کئے رکھتی ہے اور ہر وقت خوف دامنگیر رہتا ہے کہ شاید ابھی یہ میرا مفہوم نہیں سمجھے، ابھی یہ میرے دلائل و براہین سے قائل نہیں ہوئے ابھی میرے دل کے احساسات نے اِن کے دلوں میں بھی احساسات پیدا نہیں کئے اُنھیں ادھ کچرا چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ دو فقرے اور لکھ دوں جو سبق ان کو پڑھانا چاہتا ہوں وہ ابھی انہیں یاد نہیں ہوا ہے۔ اسے پھر ایک مرتبہ آموختے میں خود ہی نہ پھیر دوں؟"

بعض مقالات جو بہت غور و خوض اور فکر و تحقیق سے لکھتے تھے وہ طوالت میں بھی بڑھے چڑھے

ہوئے تھے - مولانا کا وہ مشہور و معروف انگریزی مقالہ[1] جس نے اُن کی قابلیت اور سیاست دانی کا سکہ اُن کی صحافت کے ابتدائی دور میں ہی اہلِ برطانیہ کے قلوب پر بٹھا دیا تھا انیس[19] کالم کا ایک مضمون تھا - یہ مضمون بڑی جانفشانی سے تیار کیا تھا اور اُس کی ترتیب میں مسلسل چالیس[۴۰] گھنٹے صرف ہوئے تھے - اِس کی رُوداد بھی مولانا کی زبانی سُنئے -

"میں نے یہ مضمون لگاتار چالیس[۴۰] گھنٹے کی محنتِ شاقہ برداشت کر کے لکھا ہے اور اس تمام عرصے میں ایک منٹ بھی نہ سویا اور جب خود لکھتے لکھتے تھک جاتا تو اخبار کے اسسٹنٹ منیجر ..... کو بلا بھیجتا تھا خود بولتا جاتا تھا اور اُن سے لکھواتا تھا اور اس چالیس[۴۰] گھنٹے نہ صرف سو نے سے محروم رہا بلکہ خوراک بھی قہوہ کی چند پیالیوں سے بمشکل ہی بڑھنے پائی"

("ہمدرد" ۲۳ جنوری ۱۹۲۸ء بعنوان "میری صحافت")

مولانا اپنے صدارتی خطبات میں اِس امر کا خاص التزام رکھتے تھے اور مضمون پر نظر ثانی کرتے وقت ترتیب کی درستی کے ساتھ فقروں کی ادبیت اور الفاظ کی موزونیت کا جائزہ لیتے -

مولانا کی انگریزی انشا پردازی کی خود اہلِ زبان نے داد دی ہے - کامریڈ کے اجرا کے وقت اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کے خریداروں میں کثرت سے انگریز بھی شامل تھے - اس عہد کے وائسرائے ہند بھی اس کے مستقل پڑھنے والوں میں تھے - اُن کے ذوق شوق اور دلچسپی کی یہ کیفیت تھی کہ پرچہ نکلنے والے ہفتے کے دن، جیسا کہ مولانا نے خود ایک جگہ ذکر کیا ہے، بڑی بیچینی اور بیتابی سے اس کی آمد کا انتظار کرتے اور اگر وقت مقررہ پہونچنے میں ذرا دیر ہوتی تو بار بار ٹیلیفون پر دریافت کراتے -

کامریڈ کا مزاحیہ کالم انگریزی طنزیات و مضحکات' کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرتا تھا - دور رس اشارے،

---

[1] یہ مقالہ اخبار کامریڈ میں CHOICE OF THE TURK کے عنوان سے لندن ٹائمز کے اِسی عنوان کے زیر تحت مضمون کے جواب میں لکھا گیا تھا -